کاروانِ خیال

خطوط

مولینا ابوالکلام آزاد و نواب صدر یار جنگ بہادر

مکتبۂ احباب
وَسّن پورہ ○ لاہور

قیمت　دو روپے چار آنے

ناشر　مکتبۂ احباب لاہور

طابع　استقلال پریس لاہور

کاروانِ خیال

خطوط

مولانا ابوالکلام آزاد

و

صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

مکتبۂ احباب

وسن پورہ — لاہور

حامدًا و مصلیًا و مسلمًا

مقدمہ

قلم را آں زباں نبود کہ سرّ عشق گوید باز
بروں از حدِ تقریر است شرحِ آرزو مندی

ستمبر ۱۹۴۰ء کے دوسرے ہفتہ کا ذکر ہے، میں حسبِ معمول نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی دامت معالیہ کی خدمت میں حبیب گنج حاضر ہوا تو موصوف نے قدیم شفقتِ بزرگانہ کے تحت کلکتہ سے آیا ہوا ایک خط دکھایا۔ میں اسی سال اجمیر شریف سے فارغ عن التحصیل ہو کر حضرت الاستاذ علامۃ الہند مولانا محمد معین الدین الاجمیری کی وفاتِ حسرت آیات کے بعد خاندانی دار العلوم مدرسہ حافظیہ سعیدیہ دادوں ضلع علیگڈھ

میں (جو حبیب گنج سے دو میل پر واقع ہے) مدرّس ہوا تھا۔

نواب صاحب نے علامہ طیبی المتوفیٰ ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۴۲ء کی شرح مشکوٰۃ کے دو کرم خوردہ قلمی نسخے اپنے مشہور کتابخانہ

۱؎ ملا علی قاری نے مرقات شرح مشکوٰۃ اور مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے لمعات واشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ میں اور دوسرے شارحین حدیث نے جابجا طیبی کا حوالہ دیا ہے۔ محققانہ و فقیہانہ انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کی چار جلدیں ہیں، تقریباً دو ہزار صفحات ہیں۔ میں نے دو سال کے اپنی درسی وخانگی مصروفیات کے باوجود برادر عزیز مولوی محمد زاہد خاں شروانی سلمہٗ کی مدد سے پوری کتاب نقل کر کے مقابلہ کر ڈالا، ناظم کتاب خانہ مولوی معین الدین افضل گڑھی نے بھی مقابلہ میں عرق ریزی سے کام لیا، اس کے نسخے خدا بخش لائبریری پٹنہ، فتح پوری دہلی، کتاب خانۂ قاضی رام پور میں موجود ہیں۔ صحیح اور قریب العہد نسخہ رام پور کا ہے جو کوششوں کے باوجود مقابلہ کے لیے حاصل نہ ہو سکا، فتح پوری دہلی کا نسخہ ملا، بدخطی اور اغلاط سے پُر ہے۔ نواب صاحب کا ارادہ مصر میں چھپوانے کا تھا جو جنگ کی دشواریوں کی وجہ سے معرضِ التوا میں پڑ گیا، سہولتیں ملنے پر اوّلین فرصت میں اشاعت کا انتظام کیا جائے گا۔ شاہد شروانی۔

کے لیے حاصل کیے تھے۔ کتاب کی اہمیت اور نایابی کی بنا پر مفتی عبداللطیف صاحب صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا نسخہ منگا کر، ناظمِ کتابخانہ سے اس کی نقل کرا رہے تھے۔ مجھے بھی اس کی نقل کا اشتیاق ہوا، پہلے تو پس وپیش فرمایا، آخر میری بار بار کی گذارش پر اجازت مرحمت فرمائی۔ میں ہر ہفتے جمعہ کو، مدرسہ کی چھٹی کے دن جا کر نقل شدہ اجزائے کتاب داخل کر کے دوسرے لے آتا، اسی سلسلہ میں ہر ہفتے کتاب خانہ اور صاحب کتاب کی زیارت کا موقع ملتا۔

جب وہ کلکتہ سے آیا ہوا خط دیکھا تو کیا عرض کروں، دل پر کیا گذری، ایک بار نہیں، بار بار پڑھا، ہر بار نیا کیف و سرور حاصل ہوا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اس محبت نامہ مورخہ ۲۴ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں الفاظ نہ تھے بلکہ موتی تھے جو سلکِ سطور میں پروئے گئے تھے۔ دل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو صفحۂ کاغذ پر، تصورِ صحبت گذشتہ سے متاثر ہو کر اکٹھا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

شاید ان ٹکڑوں میں تصویریں کھنچی ہوں آپ کی

یہ سمجھ کر منتشر اجزائے دل یکجا کیے!

لکھنے والے کا انداز بتا رہا تھا کہ کسی کی اچانک یاد نے دل تڑپا دیا ہے اور قلم برداشتہ دل کی بے قید و آزاد صداؤں کو گوشِ "حبیب" تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ میں نے اس نامۂ گرامی کے نقل کی بتوسط ماسٹر سید منظر علیم استدعا کی جو منظور ہوئی۔ جب نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہو گیا تو "مراسلتِ حبیبین" کے نام سے فائل بنا لیا گیا اور ماسٹر صاحب مرحوم کے زیر نگرانی زینتِ کتاب خانہ بنا' میں ۲۷ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو مولانا آزاد کی طلب پر جب دہلی حاضرِ خدمت ہوا اور "غبارِ خاطر" کی اشاعت کا تذکرہ آیا تو میں نے خطوط قبلِ نظربندی کے شمول کی بھی آرزو ظاہر کی اور ارشادِ گرامی کے مطابق وہ سب مکاتیب نواب صاحب کی منظوری اور تصدیقی دستخط ثبت کرا کے، بالترتیب نقل کر کے خدمتِ والا میں روانہ کر دیئے۔ کسی مصلحت کی بنا پر وہ خطوط شاملِ غبارِ خاطر نہ ہو سکے، ان مکاتیب میں علمی، ادبی اور تاریخی معلومات کا بے بہا ذخیرہ تھا، اہلِ علم و ادب کو اس مجموعہ سے محروم دیکھ کر کفِ افسوس ملنا پڑا۔

منتظر موقع تھا کہ دونوں بزرگوں سے گذارش کر کے منقّۂ شہود پر لانے کی کوشش کروں کہ رفیق محترم سید الطاف علی بریلوی — سپرنٹنڈنٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے حبیب گنج پہونچکر "السّابِقُونَ الاَوّلُونَ" کا درجہ حاصل کرلیا، نہ صرف اہل علم و ادب بلکہ کانفرنس کے شکریہ کے مستحق بھی ٹھہرے، کیونکہ اکس کے حقوقِ منفعت کانفرنس کے لیے محفوظ کرالیے۔ سید صاحب سے کئی بار اس مراسلت کا ذکر آچکا تھا، غالبؔ نے شاید اسی موقع کے لیے یہ شعر کہا تھا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

مجھ پر ان دونوں گرامی قدر ہستیوں کی شفقت و توجہ کا حال موصوف کو اچھی طرح معلوم تھا ہی۔ اس مجموعۂ خطوط کا جسے اب "کاروانِ خیال" — کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، دیباچہ لکھنے کی پیش کش کی۔

ملک کے دو مُسلّم الثبوت ادیب، بے مثال انشا پرداز، یگانہ

روزگار فاضل اور صفِ اول کے مشاہیر کی تحاریر پر قلم اُٹھانا بڑی دیدہ دلیری اور جرائت کا کام تھا۔ ہوش نے ہمت شکنی اور شوق نے حوصلہ افزائی کی، ہوش و شوق کی اس کشمکش نے انسان ظلوم و جہول کے ازل میں بارِ امانت اٹھانے کا واقعہ یاد دلایا جس کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝"

جب اس بارِ عظیم (خلافتِ الٰہی) کو غافل انسان نے اُٹھالیا جس کا نام سُن کر آسمان کو لرزہ اور زمین کو زلزلہ آگیا تھا، سمندر کپکپانے اور پہاڑ تھر تھرانے لگے تھے، تو اسی نوعِ انسانی کا ایک فرد ہو کر ہمت ہار جانا دیرینہ روایات کے سراسر خلاف تھا۔ یہ دونوں باکمال بزرگ تقریباً نصف صدی سے مشاہیرِ ہند میں شمار ہوتے ہیں۔ دونوں میں "عام خاص من وجہ" کی نسبت ہے۔ دو مادہ افتراق اور ایک مادہ اجتماع پایا جاتا ہے۔ جہادِ حریت میں ایک برسرِ پیکار اور

انتظامِ امورِ ریاست میں دوسرا سرگرمِ کار۔ بقارِ شانِ اسلاف یعنی پابندیِ وضع و تہذیبِ اسلامی اور ذوقِ علم تاریخ و ادب میں دونوں متحد، ذوق کی یک جہتی نے مادۂ اجتماع کو افتراق پر غالب کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۰۵ء کی پہلی ملاقاتِ لکھنؤ کے بعد دونوں کے تعلقات میں رابطہ اور رابطہ میں استواری پیدا ہوتی رہی۔ ایک نے حیدرآباد جا کر مسندِ صدارتِ امورِ شرعیہ سنبھالی اور دوسرے نے رانچی (بہار) کو ایامِ نظر بندی اور سرکاری مہمان خانوں کو زمانۂ اسیری میں پہونچ کر آباد کیا۔ راہوں کے اس بعد المشرقین نے بھی ذوق کی یکسانی میں فرق نہ آنے دیا۔ اور اس چالیس سال کی مدت میں اخلاص و مودت نے

انحاد بیست میان من و تو

من و تو نیست میانِ من و تو

کی شکل اختیار کر لی۔ "غبارِ خاطر" اسی کی ایک جھلک اور "کاروانِ خیال" اسی کا دوسرا پرتو ہے۔

نواب صدر یار جنگ بہادر کے متعلق مجلہ مصنف علیگڈھ

جنوری ۱۹۴۶ء میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بہت کچھ لکھنا باقی ہے
خدا نے موصوف کو بڑی صلاحیتوں کا مالک بنایا ہے۔ عزت و
عظمت، دولت و ریاست، جاہ و حشم اور علم و فضل کی نعمتوں سے
سرفراز اور معاصرین میں یک گونہ ممتاز ہیں۔ آپ کا جمع کردہ نادر الوجود کتب خانہ
ہندوستان کے معدودے چند مشہور کتب خانوں میں سے ایک
ہے۔ ہند و بیرونِ ہند کے فضلاء آ آ کر استفادہ کرتے رہتے ہیں۔
جرمنی و بغداد وغیرہما کو کتابیں مقابلے کے لیے جاتی رہتی ہیں بیسوں
کتابوں کے مؤلف اور کئی مفید تصانیف کے مصنف ہیں۔ علمی
و تاریخی مقالاتِ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کا مجموعہ پریس میں پہنچ چکا
ہے۔ دیوان فارسی و اردو مرتب ہو چکے ہیں۔ اسّی سال سے
متجاوز سن ہے، مگر تقریر و تحریر میں وہی شگفتگی و شوخی ہے۔ جادۂ
ادب کے پرانے سالک اور مخصوص طرزِ نگارش کے مالک ہیں،
نظم کی طرح نثر میں بھی شاعری فرما لیتے ہیں۔ ۱۳۱۴ھ میں اپنی
تصنیف "علمائے سلف" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"شوال ۱۳۱۱ھ کا ذکر ہے کہ ندوۃ العلماء کا اجلاس

شہر کانپور میں منعقد ہوا تھا جس میں دیارِ ہند کے
اکثر مشاہیر علما، رونق افروز تھے۔ بزم ان کے جمالِ
کمال سے روشن تھی اور نگاہ ان کے کمالِ جمال سے
منور تھی"

خط کشیدہ جملہ بار بار پڑھیئے اور سر دھنیئے۔ پورے پچاس
سال قبل کا جملہ ملاحظہ فرمالیا اب حال کا فقرہ یا اسی سالہ زندگی
کا تجربہ و حاصل بھی معائنہ کرتے چلیئے، مولانا ابوالکلام آزاد کو
جواب مکتوب مذکور میں تحریر فرماتے ہیں

"خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک
نعمتِ ابدی ہے"

اس جملۂ حق کی شرح، دل دردمند آزاد سے پوچھیئے۔
۲۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کے خط میں صفحے کے صفحے رنگین کر ڈالے ہیں۔
نواب صاحب کی ادبی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ سارے
ملک میں آزاد کی مخصوص علمی و ادبی مخاطبت و مراسلت کے لیے
اب موصوف ہی کی ذات رہ گئی ہے۔ فرصت کے لمحے اور تنہائی

کی گھڑیاں ان ہی سے مخاطبت میں صرف ہوتی ہیں اور علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی جیسے فاضل لگانہ تک کو رشک ہوتا ہے کہ ان خطوطِ مودّت کے "مخاطب تنہا، صدیق مکرّم حبیب الرحمن خاں شروانی ہیں....."[1]

پچھلی مرتبہ مارچ ۱۹۴۶ء میں یوپی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں لکھنؤ پہنچے اور نواب صاحب کے ورود بلدہ کی اطلاع ملنے پر جائے قیام پر پہونچکر والہانہ انداز میں بغل گیر ہوئے۔ مختصر مگر پُر لطف صحبت رہی، مشغولیتِ کار اور ہجوم افکار کے باوجود ملاقات کا موقع اُستاد ذوقؔ کے ارشاد کے مطابق نکال ہی لیا،

اے ذوقؔ کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

اس ملاقات کا ذکر نواب صاحب نے آخری خط میں کس مزے سے کیا ہے۔ دوبارہ ملنے کی سعی ناکام پر کیسے حسرت آمیز

---

[1] معارف بابت جون ۱۹۴۶ء، صفحہ ۴۰۳

فقرے لکھے ہیں۔

"غبارِ خاطر" نے دونوں کے تعلقات سے خاص و عام کو کافی روشناس کر دیا ہے۔

مدت کے بعد مولانا کے قلم کی گُل کاریاں نظر نواز ہوئی تھیں، مقبولیت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ مئی کے شروع میں پانچ ہزار کی تعداد میں یہ مجموعہ مکاتیب چھپا اور آخر ماہ تک ختم ہو گیا، پیہم طلب پر دوسرا ایڈیشن اتنا ہی تیار ہوا جو قریب ختم ہے

مولانا کے سینکڑوں مضامین و خطوط نظر سے گذرے۔ میری علمی تہی مایگی اور ادبی بے بضاعتی آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سا مضمون باخط فصاحت و بلاغت، روانی و سلاست میں دوسروں سے فوقیت رکھتا ہے۔ شادی و مسرّت کا موقع ہو یا حزن و الم کا، عیش و عشرت کے سامان مہیا ہوں یا رنج و غم کے، تبریک و تہنیت کا محل ہو، یا تعزیت و عیادت کا، ہر جگہ اشہبِ قلم یکساں دوڑتا نظر آئے گا۔ گویا نگاہوں کے سامنے وسیع میدانِ ادب ہے۔ رخشِ خامہ کو جدھر مہمیز لگا دی ہوا ہو گیا۔

یوں تو آزاد کی ہر تصنیف و مضمون میں ادبی شان پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے لیکن مجموعۂ خطوطِ "غبارِ خاطر" کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد کو سیفِ زبان و بیان پر کس قدرت حاصل ہے۔ الفاظ کی قطع و برید، حرفوں کی تراش خراش دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے:

زکدام باغ اے گل کہ چنیں خوش است بویت

الفاظ فصاحت کے سانچہ میں ڈھلتے جا رہے ہیں اور خاتمِ عبارت میں نگیں بن کر جڑے جا رہے ہیں

جب انسان میں کوئی کمال پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا صدور و ظہور بلا قصد و ارادہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ آپ نے ہارمونیم اور ستار بجانے والے کو دیکھا ہوگا اس کی نظر کسی سمت ہو خیالات غزل سرائی کی جانب متوجہ ہوں یا سامعین کی طرف آنکھوں پر پٹی بندھی ہو یا کھلی ہوں، انگلیاں اپنا کام اسی شان سے کرتی نظر آئیں گی۔ کیا مجال ہے جو کسی دوسرے تار یا سُر پر انگلی جا پڑے۔

مولانا کی نثر نگاری بھی کمال کے اسی مرتبۂ اعلیٰ پہ پہنچ چکی ہے،

گرد و پیش کے حالات اور خطرناک و سنگین حادثات بھی متاثر نہیں کر سکتے۔ خود "غبارِ خاطر" اسی کی آئینہ دار ہے۔ ۱۹۴۲ء کا پُر آشوب زمانہ ہے، جرمنی سے ۱۹۳۹ء میں جنگ چھڑ چکی ہے۔ یہ جنگ فیصلہ کُن جنگ ہے۔ یورپ کے دو مختلف سیاسی اصولوں کی لڑائی ہے۔ آمریت اور نام نہاد جمہوریت کا سخت مقابلہ ہے، برطانیہ کو تباہی و بربادی کا منظر نظر آ رہا ہے۔ ہندوستان صدیوں سے برطانوی شہنشاہیت کا غلام ہے۔ پچاس سال سے مسلسل جد و جہد آزادی جاری ہے۔ ہندوستان کی تمام آزادی خواہ جماعتوں نے اس جنگ کو سرمایہ داری کی جنگ بتا کر باشندگانِ ملک کو الگ رہنے کی اپیل کی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو اس کی مرضی کے خلاف آزادی کا وعدہ کیے بغیر جنگ میں نہیں گھسیٹا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ حکومتِ وقت ایسے باغیانہ نعرے کو ایسے نازک حالات میں کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ مختلف جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا گیا۔ ان کے رہنماؤں اور سرگرم کارکنوں کو گرفتار کر کے لمبی لمبی سزائیں دی گئیں۔ ۹ اگست ۴۲ء کی شب کو کانگریس کے سارے قائدین اچانک گرفتار کر لیے گئے بمبئی کو ساری دنیا سے بے تعلق کر دیا گیا۔ ٹیلیفون کے تار کاٹ دیئے

گئے تاکہ باہر اطلاع نہ جا سکے۔ کانگرسی رہنماؤں کی اسپیشل سخت فوجی نگرانی میں ۸ بجے صبح کو کسی نامعلوم مقام کو روانہ ہوگئی۔ پورا ہندوستان امید و بیم کی حالت میں تھا دونوں کی ضد نے ملک کو جہنم کدہ بنا دیا تھا۔ ان رہنماؤں کے متعلق یہ خیال ہو چلا تھا کہ بغاوت کا مقدمہ قائم کرکے پھانسی یا کم از کم عمر قید کی سزا ضرور ہوگی۔ خود رہنما بھی اپنے متعلق کسی طرح مطمئن نہ تھے۔

انہی اسیرانِ فرنگ میں طریقۂ یوسفی کا تابع اور سنتِ شعب ابی طالب کا متبع انڈین نیشنل کانگرس کا صدر اور آسمانِ علم و ادب کا بدر ابو الکلام آزاد بھی تھا۔ خود بیمار شریکِ حیات مسلسل گرفتارِ مرض و آزار اس پر پیہم تشبث بیداری اور ہجومِ افکار قلعۂ احمد نگر میں فوجی پہروں میں مقید و محبوس کر دیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں کے بعد تھوڑا سا سکون ملنے پر نواب صاحب کو مخاطب بنا کر

"کس بشنود یا نشنود من گفتگوئے می کنم"

کا سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے۔

اب غبارِ خاطر کے ان خطوط پر نظر ڈالیے

قلعہ احمد نگر کی تاریخی حیثیت کا بیان ہو یا گرفتاری کی روداد، چینی چاء نوشی کا پُر سرور تذکرہ ہو یا اس کے ختم ہو جانے کا فسانہ غمِ شریکِ حیات

کا نوحۂ ماتم ہو یا دردِ فراق کا قصۂ الم، چڑے چڑیا کی کہانی ہو یا قلعہ کی شکستہ و کہنہ قبر کی داستانِ حسرت و ویرانی، گلہائے چمن کا ذکرِ زینت آرائی ہو یا بلبلانِ گلشن کی کیفیت نغمہ سرائی، خدا کی وحدانیت پر دلائل قاطعہ پیش کیے جا رہے ہوں یا پھولوں کی خلقت پر براہین ساطعہ سب میں اعجاز نگاری کارفرما نظر آئے گی۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

وہ اہل علم حضرات جنھیں آزاد کے سیاسی مسلک سے اختلاف رہا ہے، جن میں متقدر علماء اور محترم پروفیسران کا گروہ بھی شامل ہے، انھیں بھی "غبارِ خاطر" پر سر دھنتے دیکھا ہے، وہ بھی آزاد کی علمی قابلیت اور ادبی صلاحیت پر معتقدین و مخلصین کی طرح ایمان رکھتے ہیں ــــ والفضل ما شہدت بہ الاعداء

وہ وقت بھی آ رہا ہے جب تاریخ بتائے گی کہ یونان کا سقراط، حران کا ابن تیمیہ، افغانستان کا جمال الدینؒ اور مصر کا محمد عبدہ اور جوہری طنطاوی، ہندوستان میں بھی ابوالکلام آزاد

کی شکل میں نمودار ہوا تھا۔

ما شئت قل فیہ فانت مصدق

والفضل یقضی والمحاسن تشھد

یا آسان طریقہ پر "با تو چہ گویم کہ تو مجنوں نہ"‘ کے اصول پر یوں سمجھے

معشوق را بدیدہ عشاق بنگرید

حسن گلاں بہ چشمِ عنادل سپردہ اند

جس نے آزاد کو دیکھ پایا ہے، اسے یہی کہتے سنا ہے

"ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی آرزو ہے"

بقول مصحفی :- ترا شوق دیدار پیدا ہوا ہے

پھر اس دل کو آزار پیدا ہوا ہے

ہر ملاقات کے بعد خود اپنا یہ حال رہا ہے۔

از در دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

۲۷ ستمبر ۱۹۴۵ء سے ۲۲ ستمبر ۱۹۴۶ء تک ایک سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ سیاسی ہنگاموں کی بنا پر مولانا کا قیام ہر پھیر کے دہلی ہی رہا۔ چھ مرتبہ زیارت کا موقع ملا۔ خدا شاہد ہے دہلی تک شد رحال

کا مقصد ملاقات کے سوا کچھ نہ تھا۔ تین ملاقاتوں میں تفصیل سے گفتگو کا موقع مل سکا اور تین میں ہجومِ اشغال کی بنا پر صرف سرسری سلام و دعا کی نوبت آسکی۔

۱۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو ۹ بجے صبح جناب عبدالمجید خواجہ بیرسٹر صدر آل انڈیا مسلم مجلس کے ساتھ حاضری ہوئی تو تقریباً پچاس موٹر اور بیسیوں تانگے کوٹھی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ ملاقاتیوں کا ہجوم کوٹھی کو گھیرے ہوئے تھا۔ یہ الیکشن کا زمانہ تھا۔ تمام صوبوں کا تاریخی انتخاب سامنے تھا۔ اطلاع پہنچنے پر طلبی ہوئی۔ پنجاب کے ایک صاحب ریش بزرگ الیکشن کے مسئلہ پر بار بار سوالات کیے جا رہے تھے۔ نازک مزاجی متحمل نہ ہو سکی۔ عتاب کا انداز دیدنی تھا۔

"بگڑنے یہ بھی زلف اس کی بنا کی"

اپنی خوش نصیبی پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے کہ خدا نے یہ رنگ بھی دکھا دیا

جی چاہتا ہے پھر انھیں اک دن خفا کریں
جی چاہتا ہے پھر انھیں دیکھیں عتاب میں!

ہلالی نے محبوب کے دونوں انداز کس خوبی سے دکھائے ہیں

گاہ آتش گاہ گل رخسارۂ جانانِ من

گل برائے دیگراں آتش برائے جانِ من

مگر یہاں معاملہ برعکس تھا۔ کاش ان بزرگ کی بجائے غصّہ میری قسمت میں آتا۔

دیکھ کر خندہ پیشانی سے حسبِ دستور سابق پیش آئے۔ مختصر صحبت رہی۔ میں نے خود جلد ہی اجازت حاصل کرلی اور واپس چلا آیا۔ فرصت ملنے پر کچھ خیال آیا اور حسبِ ذیل گرامی نامہ نے سرفراز فرمایا

دہلی۔ ۳۱ جنوری ۴۶ء

عزیزی۔ آپ اس روز آئے اور میں اس درجہ مشغول و بے کیف تھا کہ کچھ دیر بیٹھ کر آپ سے باتیں بھی نہ کرسکا۔ اسے میرے تغافل پر محمول نہ کیجئے گا۔ آپ کی محبّت و اخلاص کی وجہ سے میں آپ کو عزیز رکھتا ہوں اور معاملہ رسوم و ظواہر سے گذر چکا ہے! والسّلام علیکم

ابوالکلام

سرفرازنا موں نے پہلے بھی مشرف فرمایا تھا مگر اس نامۂ گرامی نے بہت متاثر کیا۔ بے ساختہ زبان پر سرمد علیہ الرحمۃ کی رباعی آگئی۔

ہر جا کہ روی مہر و وفا یارِ تو باد
آرام و فراغت ہمہ جا یارِ تو باد
از نامہ و پیغام فراموش مکن!
یاد آوریم بکن خدا یارِ تو باد

۲۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کی ملاقات کافی طویل رہی۔ لمبے اجلاسوں سے کچھ وقفہ ملا تھا کہ ــــ میں بلائے ناگہانی بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہم نفس کی تلاش پہلے ہی سے تھی۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

علماء و صلحاء کا تذکرہ، تاریخی واقعات، علمی مشاہدات، عملی تجربات، اور ادبی و فنی نکات کا دفتر کھل گیا۔ منہ سے پھول جھڑنے لگے۔

ہر غنچہ کہ گل گشت دگر غنچہ نہ گردد
قرباں زلبِ یار کہ غنچہ گہے گل

یا یوں کہہ لیجئے۔

تیرے نازک لبوں سے سیکھا ہے
غنچہ انداز مسکرانے کا،

ادھر یہ عالم تھا:

ایک بجلی سی تڑپ جاتی تھی ہر جنبش کیساتھ
درد بھی دل میں بہ اندازِ نگاہ یار تھا

گفتگو کا انداز، نگاہوں کی کیفیت، افہام و تفہیم کا طرز، کس کس چیز کا نقشہ کھینچوں، اور پھر!

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
حیرتے دارم کہ نازش را چساں خواہد کشید

میں محوِ حیرت بنا ہوا سوچتا ہی رہا۔

ہر ایک عنوان دردِ فرقت ہر ابتدا شرح مدعا کی
کوئی بتائے کہ یہ فسانہ سنائیں ان کو کہاں سے پہلے

پھر میں کہتا بھی تو کیا کہتا۔

کب میری ہر نگاہ سے ان پر عیاں نہ تھا وہ مدعا جو تابع لفظ و بیاں نہ تھا

اور مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی کب باقی رہی تھی؟ بقول غالبؔ

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!

چوتھی ملاقات ۱۵ ؍جون ۱۹۴۶ء کو ہوئی۔ وزارتی مشن سے روزانہ سابقہ، گفت و شنید، ورکنگ کمیٹی کے بلاناغہ اجلاس، اوقات فرصت کی قلّت، اشغال کی کثرت، ان تمام باتوں کے باوجود زیارت کی نوبت آئی، علمی و ادبی تذکرے چھڑے۔ والہ داغستانی کے تذکرۂ ریاض الشعراء اور علامہ فضل حق خیرآبادی کے رسالۂ روض المجود کی حیثیت کا بیان، مولانا معین الدین اجمیری مرحوم وغیرہ کا ذکرِ خیر۔ نواب صدر یار جنگ بہادر سے ملاقات، لکھنؤ کی کیفیت اسی قسم کی باتیں رہیں، کئی گھنٹے تک ان ہی تذکروں سے مشامِ مجلس معطر اور بزمِ سخن منوّر رہی اور اپنا یہ حال رہا:

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوقِ حضوری طول دادم داستانے را

پنڈت جواہر لال نہرو دو مرتبہ جھانک کر واپس گئے۔ پروفیسر رنگا

جو یورپ سے کسانوں کی کانفرنس میں شرکت کر کے لوٹے تھے مشتاق ملاقات تھے۔ مولوی اجمل خاں صاحب کی اجازت طلبی پر انتظار کا حکم ملا۔ شیخ حسام الدین بی۔ اے۔ امرت سری صدر مجلس احرار اسلام ہند، اور مسٹر ایس، اے بخاری ڈائریکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو دہلی کی موجودگی بھی پُر لطف و باکیف گفتگو میں حارج نہ ہوئی۔ گویا کچھ دیر کے لیے دوسرے ہی عالم میں پہنچ چکے تھے۔ ہنگامی دنیا سے کوئی علاقہ ہی نہ رہا تھا۔ "غبارِ خاطر" کے دیباچہ میں اجمل صاحب نے کتنا صحیح لکھا ہے:

"مولانا کی سیاسی زندگی کے طوفانی حوادث ان کی تمام دوسری حیثیتوں پر چھا گئے ہیں، لیکن خود مولانا نے اپنی سیاسی زندگی کو اپنے علمی اور ادبی علائق سے بالکل الگ رکھا ہے ...... ایک بے خبر آدمی اگر اس وقت کی باتوں کو سُنے تو خیال کرے کہ اس شخص کو سیاسی دنیا سے دور کا بھی علاقہ نہیں ہے اور علم و ادب کے سوا اور کسی ذوق سے آشنا نہیں ..... وہ اس وقت اپنی یکساں اور بے کیف سیاسی مشغولیت کا

مزہ بدلنے کے لیے کوئی ایسا موضوع چھیڑ دیں گے جو سیاسی زندگی کے میدانوں سے ہزاروں کوس دور ہوگا۔ علم وفن کا کوئی مبحث، فلسفیانہ غور وفکر کی کوئی کاوش، طبعیات کا کوئی نیا نظریہ تصوف واشراق کا کوئی واردہ، یا پھر ادب وانشا، کی سخن طرازی اور شعر وسخن کی بزم آرائی، غرضکہ سیاست کے سوا ہر ذوق کی وہاں گنجائش ہوگی، ہر وادی کی وہاں پیمائش کی جا سکے گی۔ اس وقت کوئی انھیں دیکھے تو صاف دکھائی دے کہ زبان حال سے خواجہ حافظ کا یہ شعر دُہرا رہے ہیں:

کمند صید بہرامے بیفگن جام مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا نہ بہرام است نے گورش"

مولوی اجمل خاں صاحب نے تو آٹھ سال کا تجربہ لکھا ہے، اور مجھے زندگی کے چند خوش گوار لمحوں ہی نے اس کی تصدیق کرادی۔ میں نے "غبارِ خاطر" کا وہ نسخہ جس پر نواب صاحب نے "ہدیۃً" اپنے دستخط اور میرا نام مزین فرما کر ازراہ قدردانی مجھے عنایت فرمایا تھا، مولانا کی خدمت میں دستخطوں کے لیے پیش کیا، تاکہ دونوں بزرگوں

کے دستخطوں کے بعد کچھ دن گذرنے پر تاریخی اہمیت کی چیز ہو جائے اور میرے کتب خانے میں بعض دوسرے نوادر کے ساتھ ایک جنس گراں مایہ کا اضافہ ہو سکے ۔ اپنی مہربانی سے نہ صرف دستخط فرمائے بلکہ یہ شعر بھی سرورق پر لکھدیا ۔

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گذشت

مولانا کی ساری زندگی مصرعِ ثانی کی حامل رہی ۔ ابتدا ہی سے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر گام زن رہے ۔خیال کی بلندی اور فکر کی رفعت نے ہمیشہ مخلوق سے الگ شاہ راہ بنوائی ۔

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو بستنِ در و من فتحِ باب می شنوم

"کہتی ہے تجھکو خلق خدا غائبانہ کیا"

پر کبھی دھیان ہی نہ دیا ۔ غائبانہ کا کیا ذکر "شاہدانہ" طور پر بھی کب محفوظ رہے ۔ میں نے جگ بیتی کو چھوڑ کر آپ بیتی سرگذشت سنا ڈالی ۔ حاشا خود ستائی مقصود نہیں ۔ مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مولانا کے اعلیٰ

کردار اور بلند و بالا اخلاق سے روشناس کرسکوں کہ جب میرے جیسے تہی مایہ انسان کے ساتھ یہ حُسنِ سلوک ہے تو اہلِ فضل و کمال اور رفقائے قدیم سے وسعتِ اخلاق کا کیا حال ہوگا؛ اور مجھ جیسے ہیچ میرز کی حضوری پر بڑی بڑی شخصیتوں کی موجودگی اثر انداز نہیں ہوسکتی اور التفات و شفقت میں حارج نہیں بن سکتی تو کسی ہمدم دیرینہ کا مل جانا ملاقاتِ مسیحا و خضر سے بہتر کیوں نہ سمجھا جاتا ہوگا۔ اسی سے نواب صاحب موصوف کے خصوصی تعلقات پر روشنی پڑتی ہے۔ جو ہم ذوق ہونے کے علاوہ مولانا سے عمر میں تقریباً اتنے ہی بڑے ہیں جتنا کہ میں مولانا سے چھوٹا ہوں۔ خوردوں پر شفقت ہی سے بزرگوں کی عظمت و توقیر کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ

"من لم یرحم صغیرنا و لم یوقر کبیرنا فلیس منّا"

افصح فصحاء العرب کا ارشاد گرامی ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے اور زمانہ بخت و اتفاق سے بھرا پڑا ہے خود بخت و اتفاق ایک معرکۃ الآرا مبحث ہے۔ فلاسفہ نے اس پر کافی طبع آزمائی کی ہے۔ خاتم الحکماء علامہ فضل حق خیر آبادی نے اپنی

اہم ترین تصنیف حاشیۂ قاضی مبارک میں دوسرے مشہور مباحث کے ساتھ اس مبحث کو بھی مستقل طور پر لکھا ہے

۱۵ رجون ۱۹۴۶ء کو چوتھی بار دہلی میں مولانا سے نیاز حاصل ہوا جس کی مختصر کیفیت درج کی جا چکی ہے۔ یہی سال گذشتہ ۱۹۴۵ء کی وہ تاریخ تھی جس میں مولانا نے دوسرے رفقاء کار کے ساتھ قید فرنگ سے نجات حاصل کی۔ اور یہی سال گذشتہ کی وہ تاریخ تھی جس میں میری مکمل تباہی و بربادی کی گئی تھی۔ اسی کو اتفاق کہتے ہیں اس موقع پر بھی مولانا ہی کے تسکین دہ الفاظ نے زخمِ جگر مرہم کا کام دیا تھا اور موصوف ہی کا اسوہ باعث تسکین ہوا تھا۔ بار بار کی گرفتاری و نظربندی، سامان اور قیمتی ذخیرہ کتب کی بربادی، زوال صحت و تندرستی اور بزمانۂ اسارت شریک حیات کی دائمی جدائی، جب یہ نقشہ سامنے آگیا تو اپنا اچانک حادثہ جو اگرچہ سنگ آمد و سخت آمد کا مصداق تھا، بھلا دینا پڑا۔ مصائب و تکالیف کی طاقت برداشت بھی اپنے اندر عجب کرشمہ رکھتی ہے۔ انسان کی ساری ترقیوں کا دارومدار

اسی پر ہے۔ حدیث میں آتا ہے

"اشد الناس بلاءً الانبیاء"

اپنے مرتبہ کے لحاظ سے ہر نبی کو اس سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ حدیث میں یہ بھی آتا ہے۔

"ما اوذی نبی ما اوذیت"

(میرے برابر کسی دوسرے نبی پر مصائب کے پہاڑ نہیں توڑے گئے)

تیرہ سالہ مکّی زندگی میں روحانی و جسمانی کون سی اذیت تھی جو مخالفین کے ہاتھوں نہ پہونچی۔

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

گھر سے باہر نکلنا دشوار تھا

جنوں میں عشق کے نکلے جو گھر سے
ادھر سے ہم چلے، پتھر ادھر سے،

یہ مرتبۂ ابتلا و امتحان خوش نصیبوں ہی کو میسّر آتا ہے۔

یہ رُتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ بہادری کسی پر حملہ آور ہو جانے میں نہیں، بلکہ غصّہ کے ضبط کرنے اور اذیّت برداشت کرنے میں ہے۔"

مولانا آزاد نے بھی سب کچھ برداشت کیا، اسوۂ حسنہ کی وہ کون سی پیروی ہے جو تھوڑی بہت نہ کی۔ گالیاں کھائیں، پتھر کھائے، اپنوں کے طعنے غیروں کے چرکے سہے، قید و نظربندی کی زندگی گذاری سامان و املاک کی تباہی دیکھی اور اس سب کے باوجود

"اللّٰھمّ اھد قومی فانّھم لا یعلمونؔ"

کی دعا کے سوا حرف شکایت زبان پر نہ لائے۔ ایک لفظ بھی اپنی مدافعت و صفائی میں نہ کہا۔ کہنے والے کو ہمیشہ فراخ حوصلگی سے معاف کیا۔ سدا کوہ وقار اور پیکرِ استقامت بنے رہے۔ ملک الشعراء ابوطالب کلیمؔ ہمدانی نے شاید مولانا ہی کے لیے کہا تھا۔

دشنام خلق را نہ دہم جز دعا جواب
ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم!

حضرت لقمان کی اپنے بیٹے کو نصیحت قرآن نے ان الفاظ میں نقل کی ہے:

یا بنیّ اقم الصلوٰۃ وامر بالمعروف وانہ عن المنکر
واصبر علیٰ ما اصابکؕ ان ذالک من عزم الامور"

(اے بیٹے! سرچشمۂ خیر، نماز کی پابندی رکھنا، بھلائیوں کا حکم اور برائیوں سے منع کرتے رہنا۔ اس فرض کی انجام دہی میں غفلت نہ برتنا، اس سلسلہ میں تمھیں جو مصیبتیں پہونچیں، انھیں برداشت کرنا۔ یہ باتیں بڑی ہی اہمیت رکھتی ہیں!)

مولانا ہر ایسے موقع پر صبر و استقامت سے یہ شعر پڑھتے نظر آئے

عمر ہیست کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے مافوق الفطرت انسان روز پیدا نہیں ہوتے۔ صدیوں میں کسی ملک کی خوش نصیبی میں اضافہ کیا کرتے ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات —!
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

بحث و اتفاق کے سلسلے میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ اسی اتفاق کے تحت دو ایک واقعے جو دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے، اور سنتے چلیئے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ بیت المقدس پر خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میمنت مہد سے اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا، ۱۰۹۹ء میں عیسائیوں نے امن پر تسلط قائم کر لیا۔ گوڈفرے اور ٹنکرو اس میں فاتحانہ انداز سے داخل ہوئے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۷ء میں تقریباً ۹۰ برس کے بعد پھر علم اسلامی لہرا دیا۔ ہندوستان پر بھی اسی عیسائی قوم نے مکمل طور پر ۱۸۵۷ء میں قبضہ کیا۔ یہاں بھی فلسطین کی طرح صدیوں سے مسلمان ہی حکمراں تھے۔ آئندہ سال ۱۹۴۷ء میں ۹۰ برس ہو جائیں گے آثار بتا رہے ہیں کہ بیت المقدس کی طرح یہ بد قسمت ملک بھی غیروں کی غلامی سے اسی میعاد کے اندر نجات پا جائے گا، انشاء اللہ تعالیٰ!

اسی اتفاق کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ جس دن سلطان نے فلسطین فتح کیا ہے ۲۷ رجب ۵۸۳ھ تاریخ تھی۔ سلطان نے نماز شکر اسی مسجد اقصیٰ میں ادا کی جس میں ۶۰۰ سال قبل شب معراج میں اسی تاریخ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے امامت انبیاء کرام فرمائی تھی۔ کیا اس طرح سلطان نے "الصلوٰۃ معراج المومنین" کا رتبہ حاصل نہ کر لیا۔

اسی قسم کا اتفاق ۱۵ر جون ۱۹۴۵ء کی تاریخ کو بھی سمجھئے۔ میری تباہی مولانا کی رہائی۔ اور پھر دوسرے سال اسی تاریخ میں یکجائی و رزم آرائی فکر کی رسائی بھی کیا چیز ہے، کبھی کبھی آسمان سے تارے بھی توڑ لاتی ہے۔ اتفاق ہے اور کیسا پُرلطف اتفاق۔ مولانا کی عمر قمری حساب سے پورے ۶۰ سال کی ہے۔ ۱۳۰۵ھ میں مکۂ معظمہ میں ولادت باسعادت ہوئی، "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوئیں۔ آخر الذکر میں ۱۳۶۵ھ کا مکتوب بھی شامل ہے۔ پورے ۳۰ سال قبل، جب کہ آفتاب عمر نصف النہار پر پہنچا ہوا تھا، مولانا کی خود نوشت سوانح عمری ۱۳۳۵ھ میں "تذکرہ" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ مرزا فضل الدین احمد کے اصرار سے مولانا نے اپنے بزرگوں کے حالات لکھے تھے، اصرارِ شدید پر کچھ اپنا حال بھی لکھنا پڑا۔ اب تذکرہ ناپید ہو گیا ہے۔ جن حضرات کے پاس ہے، وہ حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ اور کسی قیمت پر علیحدہ کرنے کو تیار نہیں۔ میں اپنے دعویٰ کی دلیل پر تھوڑا سا اقتباس پیش کروں گا۔ میں نے دعویٰ کیا تھا کہ

لہ تذکرہ۔ قیمت =/۶ مکتبہ احباب وسن پورہ لاہور سے مل سکتی ہے۔

مولانا کے مضامین و خطوط میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ایک سے دوسری عبارت کا درجہ بڑھا ہوا ہے بھی یا نہیں؟ اور اگر ہے تو کس کو کس پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہ دونوں مجموعۂ خطوط آپ کے سامنے ہیں۔ اب پورے تیس سال قبل کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"در مجلس و صالش خمہا کشید مرداں
چوں دورِ خسرو آمد مے در سبو نماندہ

یہ غریب الدیارِ عہد و نا آشنائے عصر، بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو با بی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء، مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے عدم ہستی نما میں وارد ہوا۔ اور تہمتِ حیات سے متہم!

الناس نیام اذا ماتوا فانتبھوا

شورے شدہ از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم

والد مرحوم نے فیروز بخت (۱۳۰۵) تاریخی نام رکھا تھا۔ اور مصرع ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا: ع

"جواں بخت و جواں طالع جواں باد!"

سبحان اللہ! بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی! نیمہ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی، نیمہ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور سستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزلِ مقصود کا پتہ ہے نہ شاہراہ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی تو رہ نوردی و منزل طلبی کا دروازہ نہ کھلا، اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کار فرمائی، تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی، راہ دور، اور نشان منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سر و سامان کار ناپید، وقت جاچکا اور ہر آن و ہر لمحہ کاروان مقصود سے دوری اور منزل مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمّت کی چستی واپس مل جائے۔ پھر بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے جو لٹ چکی؟ اور وہ قافلۂ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جاچکا؟

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

ساری فیروز بختی و جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں، کل فیصل ہونے والا ہے۔ "یوم تبیض وجوہ و تسود وجوہ" اصلی فیروز مندی وہاں کی فیروز مندی ہے۔ اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمایش میں پورا اُترے ....

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے۔ سلام علیٰ نجد و من حل بالنجد! (نجد اور نجد کے نازلین پر سلام و رحمت نازل ہو) مگر وطن مادری سرزمین مطہر طیبہ و دار الہجرۃ سید الکونین و شہرستانِ نبوت و وحی ہے۔ قبلۂ عبادت گذاران عشق و کعبۂ نیاز مندانِ شوق، —— علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ و التحیۃ!

دارم دل گرداں کہ من قبلہ نمامی خوانمش
روسوے ابروے کشش کند ہر چند می گردانمش

اور وطنِ حقیقی کی نسبت کیا کہیے کہ بحکم کن فی الدنیا فانک غریب، ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر، تمام مسافران ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار، سب کو ایک ہی مستقر و موطن در پیش، البتہ کسی کے لیے ساءت مستقراً و مقاماً میں داخل اور

کسی خوش نصیب کے لیے حسنت مستقرا و مقاما۔

وابرح ما یکون الشوق یوماً
اذا دنت الخیام من الخیام

مولد و منشاءِ طفولیت" وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم" ہے، یعنی مکہّ معظمہ، زاد اللہ شرفاً و کرامۃً۔ محلہ قدوہ متصل باب السلام:

بلاد بہا نمت علی تمائمی
واوّل ارض مسّ جلدی ترابہا

یہ وہ دیار ہے جہاں میری گردن میں تعویذ ڈالے گئے، یعنی جہاں بچپن کا زمانہ گذرا ہے۔ اور یہی وہ زمین ہے جس کی خاک نے سب سے پہلے میرا بدن مس کیا ہے۔ یہ شعر رفاع بن قیس الاسدی کا ہے۔ اس کے ساتھ کے دو اشعار یہ ہیں:۔

احب بلاد اللہ ما بین منعج
الیّ وسلمیٰ ان یصوب سحابہا

(باقی حاشیہ بر صفحہ ۴۰)

اس وقت کہ ۱۳۵۰ھ قریب الاختتام ہے، قافلہ برقِ رفتارِ عمر منزلِ ثلاثین تک پہونچ چکا۔

یقولون ھل بعد الثلاثین ملعبًا
فقلت، وھل قبل الثلاثین ملعبا

(لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا تیس سال کے بعد بھی کھیل کود کا موقع ہے میں کہتا ہوں کہ کیا تیس سال سے پہلے بھی کوئی کھیل کھیلا جاسکتا ہے؟)

قریب ہی کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں!

کس نمی گوید از منزلِ آخر خبرے　　صد بیاباں بگذشت و دگرے درپیش است

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹)

الم تعلمی یا دار ملحاء اننہ
اذا اجدبت اٰ وکان خصبا جنابہا

معجم البلدان میں تمت کے بجائے ینطمت کا لفظ ہے اور مقدمہ مطوّل میں شعر یوں درج ہے:-

دیار بہا حل الشباب تمیمتی　　فاول ارض مسّ جلدی ترابہا

آپ نے اتفاق ملاحظہ کیا۔ ۱۳۰۵ھ کی پیدائش، ۱۳۳۵ھ میں اشاعتِ تذکرہ اور ۱۳۶۵ھ میں اشاعتِ مجموعہ مکاتیب "غبارِ خاطر" اور کاروانِ خیال "۔ لگے ہاتھوں یہ اتفاق بھی ملاحظہ کرتے چلیئے کہ پہلا خط ۴ ستمبر ۱۹۴۰ء کو لکھا گیا تھا، اور آخری خط ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو۔ اس مجموعہ کا آخری خط ۱۱ مئی کی رسید وصول مکتوب کو چھوڑ کر ۴ ستمبر ۴۵ء ہی کا ہے۔ اتفاقات کو کہاں تک لکھا جائے۔ یہ تو صرف وہ چند اتفاقات تھے جو اس مجموعہ اور اس کے متعلقین سے وابستہ ہیں۔ چونکہ فلسطین و ہندوستان کی صورت حالات یکساں تھی اور جدوجہد آزادی کے تقریباً نصف صدی سے مولانا رکن رکین تھے اس لیے اس کا بھی ذکر آ گیا۔ بڑے لوگوں میں ایسے خوش نصیب کم ہوتے ہیں جن کی سوانح عمریاں ان کی زندگی میں مرتب ہو جائیں۔ اس معاملہ میں مولانا خوش نصیب ہیں۔ انگریزی اور اردو میں مختلف لکھنے والوں نے اپنے ذوق کے مطابق حالات مرتب کیے ہیں ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۹ء میں تذکرہ شائع ہوا تھا، دو سوانح عمریاں صدارت انڈین نیشنل کانگرس بہ اجلاس رام گڑھ ۱۹۳۹ء میں لکھی گئیں، مسٹر

مہادیو ڈیسائی نے کافی صفحات کی کتاب حالات میں لکھ ڈالی جو یورپ میں بھی کافی مقبول ہوئی، ابھی حال میں کئی سو صفحے کی سوانح حیات مسٹر راجپوت ایم۔ اے کی لکھی ہوئی انگریزی میں سامنے آئی۔ مولانا پر بے شمار مقالہ نگاروں میں چوٹی کے رہنما اور صفِ اوّل کے مشاہیر اہلِ قلم، علامہ سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، مسٹر آصف علی، چراغ حسن حسرت، یوسف مہر علی، مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی، نصر اللہ خاں عزیز، مسٹر مہادیو ڈیسائی، پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر جان گنتھر کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ عبداللہ بٹ نے مقالوں کا مجموعہ بھی شائع کیا ہے اور مختصر حالات علیحدہ بھی لکھے ہیں۔ ایسا بھی کم ہوتا ہے کہ بڑا آدمی خاندان و حسب نسب کے اعتبار سے بھی بڑا ہو، ہمارے یہ دونوں بزرگ اس سعادت سے بھی بہرہ اندوز ہیں۔

خاندانی عزت و وجاہت، نسبی نجابت و شرافت اور حسبی علوِ رفعت سے بھی مالا مال ہیں۔ ایک اگر نامور شروانی قوم کا فخرِ خاندان فرد ہے تو دوسرا صدیقی نسل کا چمکتا ہوا چراغ اور خاندانِ علما و صلحا کا بدرِ منیر۔ ایک کے اجدادِ کرام نسلاً بعد نسلٍ امارت و ریاست سے

بہرہ ور رہے ہیں تو دوسرے کے آباءِ عظام مسند آراءِ علم و معرفت ایک کے مورث اعلیٰ عمر خاں شروانی وغیرہ وزراء و امراء سلطنت ہند ہوئے ہیں، تو دوسرے کے اسلاف قاضی القضاۃ، مفتی اعظم اور رکن المدرسین کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز۔

یہ شرف و عزت اضافی ہے، اس پر فخر و غرور عالی ظرفوں کا کام نہیں، یہ اختیاری کب ہے؟ اور غیر اختیاری پر فخر و غرور کیسا؟ عرفی نے کیا خوب کہا ہے:

امانبود وصفِ اضافی ہنر ذات
ایں فتویٔ ہمت بود ارباب ہمم را،
ایں برق نجابت کہ جہد از گہر من
مدح است ولے گوہرِ ذاتِ اب و عم را
وصفِ گل و ریحاں بہ ہوا باز نہ گردد
ہر چند ہوا عطر دہد قوتِ شم را
المنۃ للہ کہ نیازم بہ نسب نیست
اینک بہ شہادت طلبم لوح و قلم را،

یہ وہی عرفی شیرازی ہیں جن کی عمر بھر کی کمائی، یعنی مکمّل و مرتّب دیوان ہاتھ سے چھوٹ کر دریا میں گر گیا، کشتی میں بیٹھے کہیں جا رہے تھے، صدمہ ہوا اور ہونا بھی چاہیئے تھا، تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور برجستہ یہ شعر کہا:

گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست

از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

یہ ہے اصل نجابت و شرافت۔ اب جو کچھ کلام ہے، یہ اس کے بعد کا کہا ہوا ہے۔ اسی لیے نادر شاہ نے استفساراتِ نسب نامہ کے موقع پر اپنے آپ کو شمشیر ابن شمشیر ابن شمشیر کہا تھا۔ خود مولانا نے تذکرہ کے ابتدائی اوراق میں اس پر کافی لکھا ہے۔ اسلاف کرام کے حالاتِ فضل و کمال لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

"انسان کے لیے معیارِ شرافت جوہرِ ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لیے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج

ہوں۔ اربابِ ہمّت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے، اور اپنی رفعت وعظمت کی تعمیر صرف اسی سامان سے کی ہے جو خود اُن کا اپنا بنایا ہوا تھا۔ نپولین کا ایک قول مجھے نہیں بھولتا۔ فتح پروشیا کے بعد جب فریڈرک اعظم کی قبر پر گیا تو دیکھا کہ فریڈرک کی تلوار قبر پر لٹک رہی ہے۔ نپولین نے تلوار اتار کر ایک ساتھی کے حوالے کی اور کہا کہ پیرس کے عجائب خانہ کی نذر کروں گا۔ یہ سن کر جنرل نے کہا، اگر مجھ کو ایسی باعظمت اور تاریخی تلوار ملتی تو کبھی کسی دوسرے کو نہ دیتا" نپولین نے کہا "کیا میرے پاس میری تلوار نہیں ہے؟" خاندان کے فخر کا بُت بھی عہد جاہلیت کی ایک مشئوم یادگار ہے اور اسلام نے انسان کے بہت سے بنائے ہوئے بتوں کے ساتھ اس بُت کو بھی توڑ دیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ کل کو ایک نو مسلم چمار اپنے حُسنِ عمل سے وہ مرتبہ پائے جو شیخ الاسلاموں کی اولاد کو نصیب نہ ہو۔ یہ کل کو ہونے والی بات ہے، اور آج بھی دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ "عمل" کا فرشتہ کتنے ہی بڑوں کو چھوٹا کرتا رہتا ہے اور کتنے ہی چھوٹوں کو بڑا بناتا ہے۔

"کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست"

مولانا کے متعلق اس سے زیادہ کیا لکھوں

گوہرے کز دو کون بیرون است

می تواں یافت در خزانۂ ما،

نواب صاحب کے متعلق مجلّہ مصنّف علیگڈھ، جنوری ۱۹۴۶ء

میں لکھ ہی چکا ہوں۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں اُن کی

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں۔

جا کر ملیئے، جی خوش ہو جائے، بزرگوں کی حکایتیں، اسلاف کی داستانیں، صحابۂ کرام کے حالات، اُسوۂ حسنہ کی تعلیمات، لسان الغیب حافظ کے دیوان کے اشعار، یہی مجلس کی گفتگوئیں اور یہی محفل کی باتیں۔ متعنا اللہ بطولِ بقائہٖ

شروانی خاندان میں نواب صاحب سے بڑھ چڑھ کر بعض صاحب ثروت و ریاست بزرگ گذرے ہیں۔ علم و عمل کے لحاظ سے بھی بعض ملک میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مصنّف و مؤلف بھی

ہوئے ہیں، لیکن یہ علم و عمل اور فضل و کمال کسی دوسرے کو حاصل نہ تھا۔ بلا خوف لومۃ لائم کہا جا سکتا ہے کہ پوری نسل میں ایسی جامع صفات ہستی آج تک نہیں گذری۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار نظام کی نظر توجہ اپنے استاد نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں کی وفات کے بعد ان پر پڑی اور ۱۳۳۶ھ میں صدارت امارتِ شرعیہ کے عہدہ پر سرفراز فرمایا۔ صدر الصدور کے لقب سے ملقب ہوئے۔ ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۲۲ء میں نواب صدر یار جنگ بہادر کا خطاب ملا۔ ۱۳ سال تک یہ خدمت انجام دے کر پیرانہ سالی کی بنا پر مارچ ۱۹۳۰ء میں سبکدوشی حاصل کرلی۔ ہندوستان کے تمام مشہور اداروں کے رکن و عہدہ دار ہیں۔

اب اپنے کتاب خانہ حبیب گنج ضلع علیگڈھ کی نادر الوجود کتابوں کے مطالعہ میں وقت صرف فرماتے ہیں۔ مولانا آزاد کا تدبّر و تفکر علم و ادب تقریر و تحریر اور فضل و کمال بدوِ شعور ہی سے وجہ کشش رہا۔ علمی تبحر کے ساتھ سیاسی جد و جہد اور ایثار و قربانی نے اعتقاد کا درجہ عطا کردیا۔

دین و دل ربود از من جنبش دو ابرویش

دو چشم مست او بردہ ہوشیاری ہا،

اپنی نااہلی کا پورا اعتراف ہے۔ دونوں باکمال بزرگوں کی فرطِ عقیدت نے یہ سطریں قلم سے نکلوا دی ہیں اور میں فخر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "کاروانِ خیال" کے دیباچہ لکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے:

گرچہ از نیکاں نیم خود را بہ نیکاں بستہ ام

در ریاضِ آفرینش رشتۂ گلدستہ ام

مکاتیب کے متعلق میں نے کچھ نہ لکھنے کے برابر لکھا ہے

مشک آن است کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید

ناظرین کی رائے پر چھوڑ دیا ہے۔ البتہ مولانا کے خطوط میں لکھے ہوئے عربی اشعار کا بالترتیب ترجمہ و مطلب اور ضروری معلومات کا آخر میں درج ناگزیر ہے تاکہ عربی سے ناواقف حضرات بھی اس سے فائدہ اٹھالیں

کان لم یکن بین الحجون الی الصفا

انیس و لم یسمر بمکۃ سامر!

گویا حجون[1] سے لے کر صفا[2] تک نہ تو کوئی انیس وہمدم رہا اور نہ مکہ ہی میں کوئی رات کا ہم جلیس وہم صحبت قصہ گو باقی رہا۔

یہ عمروالخزاعی کا شعر ہے۔ قریش سے پہلے قبیلہ خزاعہ ہی سکان حرم اور خدام کعبہ تھے۔ شاعر نے فراق مکہ اور خزاعہ کی جدائی خانۂ کعبہ پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اشعار کہے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک شعر یہ بھی ہے

۲۔ وحدثتنی یاسعد عنها فزدتنی
جنونًا فزدنی من حدیثک یا سعدُ

اے سعد! تو نے محبوبہ کا ذکر چھیڑ کر میرے جنون میں اضافہ کر دیا مہربانی کر کے اپنی گفتگو دراز کرتا کہ میرا جنون بھی بڑھتا چلا جائے۔)

۳۔ عیون المھٰی بین الرصافۃ والجسر[3]
جلبن الھوی من حیث ادری ولا ادری

---

[1] حجون پہاڑ ہے اسفل مکہ میں

[2] کوہ صفا مشہور و معروف ہے [3] جسر پل کو کہتے ہیں۔ بغداد کا پل مراد ہے

رصافہ اور جسر کے درمیان رہنے والی جنگلی گایوں کی نشیلی آنکھوں نے محبت کو ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ علی بن الجہم کے مطلع کا ایک مصرع درج مکتوب کیا گیا ہے۔

۴- اقول لصاحبی والعیس تھوی
بنا بین المنیفة فی الضمار
تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار
شھور ینقضین وما شعرنا
بانصاف لھن ولا سرار
فاما لیلھن فخیر لیل
واطیب ما یکون من النھار

میں نے اپنے ساتھی سے کہا جب کہ اونٹ چشمۂ بنو تمیم منیفہ اور ضمار (گاؤں) کے درمیان ہمیں لیے ہوئے تیزی سے چل رہے تھے۔

نرگسِ نجد کی خوشبو سے فائدہ اُٹھا لے۔ آج کی شب کے بعد

پھر اس کا میسّر آنا مشکل ہے۔

یہ عیش و طرب اور خوش وقتی کے ایسے مبارک مہینے ہیں کہ گذرے چلے جارہے ہیں، اور ہمیں ان کے نصف اور خاتمہ کا پتہ بھی نہیں چلتا، یعنی عیش کے دن چونکہ جلدی گذرتے ہیں اور انسان عیش و آرام و غفلت میں سرشار رہتا ہے، اس لیے لمبے وقت گذرنے کا علم بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہمیں بھی اوقات کا پتہ نہ چل سکا

ان مہینوں کی راتیں بہترین راتیں ہیں، اور دن بھی بڑے خوشگوار ہیں۔ اطیب کی جگہ اقصر کا لفظ نظر پڑا۔ "واقصر مایکون من النہار" یعنی ان مہینوں کے دن کس قدر چھوٹے ہیں۔ راحت کے دن چھوٹے اور کم ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مصیبت کی گھڑیاں ہی کاٹے نہیں کٹ کرتیں۔

مولانا نے اول و آخر کے چار اشعار نقل کیے ہیں، دو شعر درمیان میں رہ گئے ہیں، وہ بھی سُن لیجئے۔ حماسہ وغیرہ میں شاعر کا نام ہی نہیں دیا گیا۔

صاحب معاہدۃ التنصیص شرح شواہد التلخیص نے ان اشعار کو

الصمۃ القشیری کی طرف منسوب کیا ہے اور قیل کہ کر جعدہ بن معاویہ کا قول بھی نقل کر دیا ہے۔ درمیانی اشعار یہ ہیں

الا یا حبذا نفحات نجد!
وریّا روضۃ بعد القطار
واھلك اذ یحلّ الحیی نجداً
وانت علی! زمانك غیر زار

نجد کی خوشبوئیں اور اس کے باغیچوں کی بارش کے بعد تر و تازگی کیسی دل فریب و خوشگوار ہے:
نجد کے رہنے والے محبت کیے جانے کے قابل ہیں۔ یہاں آنے کے بعد انسان اپنے زمانے کا شاکی نہیں ہوتا۔ یعنی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر مسرت و شادمانی سے زندگی گذارتا ہے۔

قلبی یحدّثنی بانك ملتفی
روحی فداك عرفت ام لم تعرف

میرا دل مجھے بتا رہا ہے کہ تو مجھے ہلاک کرنے والا ہے میری جان تجھ پر فدا ہو، خواہ تجھے اس کا علم ہو یا نہ ہو۔

شرف الدین ابو حفص عمر ابن الفارض المتوفی ۶۳۲ھ کے ۵۱ اشعار کے قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔ ساتویں صدی ہجری میں بڑے پایہ کے بزرگ و ادیب گذرے ہیں۔ کلام کا اکثر حصہ معرفت میں ڈوبا ہوا ہے۔ نظرِ غور سے دیکھا جائے تو یہ مطلع اور سارا قصیدہ بھی معرفت میں ہے۔ دوسرا شعر یہ ہے:

لم اَقضِ هواكُ ان كنت الذى

لم اقضِ فيه اسىً مثلى من يفى'

تیری محبت کا حق ادا نہ کر سکوں گا، اگر تیرے غم میں جان نہ دے سکا اور میرے جیسا باوفا عاشق وفاءِ عہد ہی کرے گا۔

یہ بزرگ سلطان محمد کے زمانے میں گذرے ہیں۔ سلطان کو علم ادب اور شعراء و ادباء سے بڑی دلچسپی تھی۔ ایک مجلس میں سلطان نے کہا کہ سب سے دشوار قافیہ کے اشعار پڑھے جائیں۔ بحث کے بعد مشکل ترین قافیہ یائے ساکن کا مانا گیا۔ شعراءِ دربار نے اشعار سنانا شروع کیے۔ آٹھ دس اشعار سے زیادہ کوئی نہ سُنا سکا۔ آخر میں سلطان نے پورے پچاس اشعار کا اس قافیہ میں

قصیدہ سنایا۔ قاضی شرف الدین نے آخر میں عرض کیا کہ میں ڈیڑھ سو اشعار کا ایک ہی قصیدہ سناتا ہوں اور یہ کہہ کر

سائق الاظعان یطوی البیدطی
منعمان عرّج علی کثبان طی

پورا قصیدہ سنایا۔ سلطان نے اظہار حیرت کرتے ہوئے کہا میرے کتاب خانہ میں شعراء جاہلیت و اسلام کے دواوین بھرے پڑے ہیں۔ پوری تلاش کے بعد میں پچاس اشعار سے زیادہ پر واقفیت حاصل نہ کر سکا۔ یہ قصیدہ تم نے کہاں سے حاصل کیا اور اس کا کہنے والا کون باکمال و قابل قدر شخص ہے؟ قاضی صاحب نے علّامہ ابن الفارض کا نام و مقام بتایا۔ سلطان مشتاق ملاقات ہو کر قاہرہ پہنچا قاضی صاحب کو ایک ہزار دینار نذر کے لیے دے کر کہا کہ ہماری طرف سے پیش کر کے کہنا کہ:

"تمہارے سعادت مند ولد محمد نے سلام عرض کیا ہے اور تمنائے ملاقات ظاہر کی ہے۔"

قاضی صاحب نے عذر پیش کیا کہ نہ تو ابن الفارض اس نذر کو

قبول کریں گے اور نہ اس پیغام رسانی کے بعد مجھے حاضرِ دربار ہونے دیں گے۔ سلطان کے اصرار پر مجبوراً جانا پڑا۔ جب حرفِ مطلب ادا کیا گیا تو ایک سال کے لیے اپنے یہاں آنے کی بندش کرتے ہوئے مجلس سے اٹھا دیا۔ سلطان نے حسرت سے کہا کہ میرے زمانہ میں ایسی ہستی موجود ہو، اور میں زیارت سے محروم رہوں،

ایک روز اپنے چند مصاحبین کو لے کر پہنچ ہی تو گئے۔ علّامہ کو پتہ چلا تو دوسرے دروازے سے نکل کر اسکندریہ چلے گئے اور زمانۂ دراز تک وہیں رہے۔ دیکھا آپ نے اہلِ سطوت و ثروت کی مردم شناسی و قدر دانی اور صلحا و علماء اور اہلِ کمال کا استغناء و روگردانی!

وابرح مایکون الشوق یومًا
اذادنت الخیام من الخیام!

جس روز محبوب کے خیموں سے حبیب کے خیمے قریب ہوں گے اس روز شوق کا کیا عالم ہوگا!

فارسی شاعر نے بھی اس مضمون کو خوب ادا کیا ہے:

وعدۂ وصل چوں شود نزدیک آتشِ شوق تیز تر گردد!

تزئین الاسواق میں ابرح کے بجائے اعظم کا لفظ ہے۔ معنی میں کوئی خاص فرق پیدا نہیں ہوتا۔

۷ ولیس للّٰہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی الواحد

اللہ کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں کہ سارے عالم کو ایک ذات میں جمع کر دے۔ یعنی ایک شخص کو بہت سے کمالات عطا فرما دے

یہ شعر ابو نواس المتوفی ۱۹۹ھ کے ان چھ اشعار میں سے ایک ہے جو خلیفہ ہارون رشید کو فضل بن ربیع کی تعریف میں لکھ کر پیش کیے گئے تھے۔ اس سے اوپر کے دو شعر یہ ہیں:

انت علی ما بک من قدرۃ

فلست مثل الفضل بالواجد

اوجدہ اللہ فما مثلہٗ

لطالب ذاک ولا ناشد

خلیفہ کو مخاطب کر کے شاعر کہتا ہے کہ اپنی تمام دولت و ثروت

قدرت وسطوت کے باوجود فضل بن ربیع جیسا دوسرا کامل نہیں پا سکتا
اللہ نے اسے یگانہ و یکتا بنایا ہے طلب و تلاش کے باوجود اس جیسا
دوسرا نہیں مل سکتا!

پہلے شعر کا پہلا مصرع یوں بھی بعض مقامات پر دیکھا:

"ولیس علی اللہ بمستنکر"

اسی شعر کے ہم معنی ابن قلاقس نے بھی شعر کہا ہے:

وقد جمع اللہ فیک الانام

ولیس علیہ بمستنکر

اللہ نے تیری ذات میں سب خلق جمع کر دی ہے اور یہ سب
کچھ اس پر دشوار نہیں،

۸۔ ومن بعد ھذا مایدق بیانہ

وما کتمہ احظیٰ لدیہ واجمل

اس تمام روداد غم کے بعد ایک بات ایسی بھی ہے جس کا بیان
حد درجہ دشوار اور اس کا پردۂ خفا میں رہنا زیادہ پسندیدہ و مستحسن
ہے۔

۹- قلیل منکَ یکفینی ولکن
قلیلکَ لا یقال لہٗ قلیل

تیری جانب سے تھوڑی بات بھی میرے لیے بہت کافی ہے کیونکہ تیرے تھوڑے کو تھوڑا کہا ہی نہیں جا سکتا۔

ایک دوسرے شاعر نے اسی مضمون کو کس خوبی سے ادا کیا ہے اور حبیب کے لفظ نے اس موقع کے مناسب کتنا لطف پیدا کر دیا ہے

لا تحقرن قلیل من احبتہ
ان القلیل من الحبیب کثیر

اپنے محبوب کی کم توجہی کو کم نہ سمجھ، دوست کا تھوڑا بھی بہت ہوتا ہے

الیس قلیلاً نظرۃ ان نظرتھا
الیک وکلا لیس منکَ قلیل

میرا تیری طرف ایک نظر دیکھ لینا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، لیکن تیری ایک نظر اے محبوبہ! کم نہیں کہی جا سکتی۔

ابو معاذ نے بخیل کی تعریف میں یہی مضمون ادا کیا ہے:

فانّ اقلّ لی البخیل عذرتہ
ان القلیل من البخیل کثیرٌ

بخیل کا تھوڑا دینا ملامت کا مستحق نہیں، اسے معذور سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ بخیل کا تھوڑا بھی بہت کا حکم رکھتا ہے۔

اسحٰق بن ابراہیم الموصلی کہتا ہے:

ان ماقلّ منک یکثر عندی
وکثیر ممن تحب القلیل

اے محبوبہ! تیری تھوڑی سی نگہ التفات میرے نزدیک خزانۂ بیکراں کا حکم رکھتی ہے اور تیرے حبیب کا تیری طرف ہر وقت متوجہ رہنا بھی کم ہی سمجھا جائے گا۔ دوسرے مصرع کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جسے تم محبوب رکھتے ہو، اس کی تھوڑی توجہ بھی بہت ہوتی ہے۔

۱۰۔ کیف الوصول الیٰ سعاد ودونہا
قلل الجبال وبینهن حیوف

سعاد تک کیسے پہونچا جا سکتا ہے۔ اس کی راہ میں پہاڑوں کی چوٹیاں اور ان کی گھاٹیاں حائل ہیں۔

مولانا نے ۲۰ر جون ۱۹۴۲ء کے مکتوب سامی میں اسند رام مخلص کی کتاب مرأۃ المصطلحات کے متعلق دریافت کیا ہے اسکا جواب شامل مکاتیب نہیں ہے۔ اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ کتابخانہ حبیب گنج میں ہے نہ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں۔ لٹن لائبریری میں "حالات عہد محمد شاہ بادشاہ غازی" خود مخلص کے ہاتھ کے لکھے ہوئے موجود ہیں۔ آخر میں ناقص ہے۔ ۲۴ر ذیقعدہ ۱۱۶۰ھ کی لکھی ہوئی ہے۔ محمود افغان حارس قندھار و مسلط ایران کے حالات سے ابتدا ہوئی ہے اور بابا بادر کاہی درویش اور اسکے احوال پر اختتام۔ اسکے جلیس و ہم صحبت سراج الدین علی خاں آرزو اور میر شمس الدین فقیر بھی صاحب تصانیف اور فاضلان عہد میں سے ہیں۔

سراج الدین علیخاں آرزو کی مصنفات، تصحیح غرائب اللغات موہبت عظمیٰ (معانی و بیان) اور عطیۂ کبریٰ (عروض) محررہ ۱۲۱۵ھ و ۱۲۳۵ھ اور میر شمس الدین فقیر کی تصانیف خلاصۃ البدیع اور تذکرۂ شعرا محررہ ۱۲۶۳ھ بقلم میر نواب موزوں بھی لٹن لائبریری میں محفوظ ہیں مرأۃ المصطلحات غالباً طبع نہیں ہوئی اسکا کوئی نسخہ نظر سے نہیں گذرا۔

محمد عبد الشاہد خاں شروانی
اورینٹلسٹ لٹن لائبریری، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

بیت المصنف
کانفرنس کمپاونڈ، مسلم یونیورسٹی علیگڈھ
۱۶ر ذی قعدہ ۱۳۶۵ھ، مطابق ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۶ء

۱۹- اے، بالی گنج - سرکلر روڈ، کلکتہ

۴؍ ستمبر ۱۹۴۰ء

صدیقی العزیز۔

آج الماریوں میں ایک کتاب ڈھونڈھ رہا تھا۔ اتفاقاً ایک مجلّد پر نظر پڑ گئی۔ دیکھا تو ارشاد الکملا و غیرہ ندوہ کے بعض رسائل کا مجموعہ تھا۔ اس مجموعہ کو دیکھتے ہی ذہن ندوہ کی صحبتوں کی طرف منتقل ہوا اور پھر اچانک آپ یاد آ گئے

قاصد سے کو کہ فرستم بہ تو پیغامے چند

بے اختیار جی چاہا کہ آپ سے ملاقات ہوتی، افکارِ زمانہ اور کاوش ہائے روزگار سے الگ ہو کر دو گھڑی بیٹھتے اور پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرتے۔ جام و مینا کا دور نہ سہی، چائے کے پیالہ ہائے پیہم کیا کم ہیں۔

زخیلِ دردکشاں غیر ما نماند کسے   بیار بادہ کہ ما ہم غنیمتیم بسے

مڑ کے دیکھتا ہوں تو گذری ہوئی صحبتیں ایک ایک کر کے سامنے آتی ہیں، اور کچھ دیر کے لیے ایک بالکل دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیتی ہیں۔ آپ سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی، جب الندوہ کی اڈیٹری کے سلسلہ میں وہاں مقیم تھا۔ ۱۹۰۵ء کی بات ہے۔ پورے پینتیس برس ہو گئے۔ اس وقت یاد آ رہا ہے کہ آپ دیوان صائب کا ایک نسخہ عبدالحسین سے لینا چاہتے تھے۔ اس کی حیثیت پر گفتگو ہوئی تھی۔ دہلی کا جلسہ ندوہ آپ کو یاد ہے؟ غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء کی بات ہو گی مرحوم مولانا شبلی آپ اور میں، مولوی عبدالاحد مرحوم کے یہاں ٹھہرے تھے اور شب و روز صحبتیں رہتی تھیں۔ امین آباد لکھنؤ میں مولانا مرحوم کا بالاخانہ اور لیگ کے جلسہ کے موقع پر وہاں قیام! یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے۔ اٹھائیس برس ہو گئے۔ اس وقت سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ لبثنا یوماً او بعض یوم اور لم یلبثوا الا عشیۃً او ضحٰھا کا شاید یہی مطلب ہے۔ ۱۹۱۴ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں ٹھہرا تھا۔ آپ بھی دہلی آئے اور پانی پت کا بہ اتفاق سفر کیا۔ اس سفر کی صحبتوں

کی ایک ایک بات اس وقت صفحۂ دماغ پر ابھر رہی ہے، افسوس جتنے ہم نفس تھے، ایک ایک کر کے سب رخصت ہو گئے۔ وہ صحبتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ اب برسوں گذر جاتے ہیں، ایک متنفّس بھی میسّر نہیں آتا جس سے دو گھڑی بیٹھ کر اپنے ذوق طبیعت کی چار باتیں کر لوں، اب نہ تو زمانہ ہماری طبیعتوں کا متحمل ہے، نہ ہم زمانہ کے سانچوں میں ڈھل سکتے ہیں۔

کان لم یکن بین الحجون الی الصّفاء
انیس ولم یسمر بمکۃ سامرٗ

اس وقت صبح کے ساڑھے چار بجے ہیں، چائے پی رہا ہوں اور یہ خط لکھ رہا ہوں ؎

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم
بُعد منزل نہ بود در سفر روحانی!

یہ ساری دراز نفسی اس لیے ہے کہ کسی ہم نفس سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ آپ یاد آ گئے، ملاقات میسّر نہیں ہے تو دل کی آرزومندیوں کو صفحوں پر بکھیر رہا ہوں ؎

در ہیچ نسخہ معنی لفظِ امید نیست — فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

اس وقت سوچ رہا تھا آپ سے آخری ملاقات کب ہوئی تھی؟ غالباً سنہ ۱۹۲۰ء میں حکیم صاحب مرحوم کے یہاں دہلی میں۔ میں نظر بندی سے چھوٹا تھا، آپ حیدر آباد سے آئے تھے۔ دونوں جہتوں میں بُعد المشرقین تھا۔ مگر طبیعت کی ہم ذوقی ایک صحبت میں جمع کر دیتی تھی ؎

بیا کہ رونق ایں کارخانہ کم نشود — ز زہد ہمچو توئی یا بہ فسق ہمچو منی

معلوم نہیں ملّا[1] صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کا کیا حال ہے؟ ان کا "کُونین" کو "کَوْنَیْن" بہ وزن "زوجین" کہنا اس وقت بھی دماغ میں گونج رہا ہے۔ آپ کو موقعہ یاد آیا؟ جلسۂ ندوہ کے موقع پر جب مولوی عبدالاحد مرحوم یہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور مجھے بخار آیا تھا، میں نے کونین کی مقدار بڑھانا شروع کی اور ملّا صاحب نے اس کے مثالب و قبائح پر مسلسل لیکچر دینا شروع کر دیا۔ افسوس اب ان صحبتوں کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے!

اب اذان ہو رہی ہے، خط ختم کرتا ہوں، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام کان اللہ لہ

---

[1] حاجی ملا احمد، مصاحبِ خاص و قدیم نواب صدر یار جنگ بہادر، سفر و حضر کے جلیس و ظریف ہیں، عمر میں بڑے ہیں۔

حبیب گنج، ضلع علیگڈھ

قلم را آں زباں نہ بود کہ سِرِّ عشق گوید باز
بروں از حدِ تقریر است شرحِ آرزومندی

صدیق حبیب، حماک اللہ عن شر النوائب جو محبت نامہ
$4\frac{1}{2}$ صبح کو دوران جارمیں لکھا گیا تھا، $3\frac{1}{2}$ بجے سہ پہر کو عین
جلسہ جار میں پہونچا۔ مُلّا صاحب "ہم پیالہ" تھے۔ ان کے گوشِ شوق
میں ایک مہربان کی صدا آرہی تھی

چوں با حبیب نشینی، بادہ پیمائی
بیاد آر حریفان بادہ پیما را

کیا کہوں کس قدر مسرت نامۂ گرامی پڑھ کر ہوئی۔ اسی وقت مکرر
پڑھا۔ اس کے بعد کئی بار پڑھ چکا ہوں، ہر بار دماغ دل بوئے محبت
سے باغ باغ ہوا ہے۔ خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامہ ہستی میں

یہی ایک نعمت ابدی ہے۔ آپ نے جتنے واقعات یاد کیے ہیں، یاد دلائے ہیں سب کی مدت دہائیوں سے زیادہ ہے مگر خط پڑھنے میں دل ان کی گرمی اس طرح محسوس کرتا تھا گویا اسی صحبت میں ہے۔ بات میں بات، دلّی کے جلسۂ ندوہ میں آپ کی تقریر کا عالم یادِ شوق میں تازہ ہے۔ آپ کے کھڑے ہونے کا انداز، تقریر کا جوش آواز کا لہجہ گویا دیکھ رہا ہوں، سُن رہا ہوں، حالاں کہ تیس برس گذر گئے، سید رشید رضا کی عربی تقریر کا اردو ترجمہ آپ سُنا رہے ہیں کان سُن رہے ہیں۔ اسی مثال سے متاثر ہوکر میں نے اسٹریچی ہال میں (ان کی) عربی کی اُردو کردی تھی۔

مولانا شبلی پر خدا کی رحمت۔ اب تک ان کی یاد جان آفریں ہے۔ دارالمصنفین میں تو گویا تجدید بیعت ہوجاتی ہے۔

دماغ دل دریں گاہ گاہے جان میگردد
خدا آباد تر سازد خراباتِ محبت را

جس زمانے میں آگرہ میں پڑھتا تھا، نصف صدی گذر چکی ہو فیضی کی ایک غزل پڑھی تھی۔ اس کا ایک شعر اب تک وردِ دل ہو

کون کہہ سکتا ہے کہ کتنی بار اور کتنے موقعوں پر تسلی بخش ہوا ہے۔

اے ہم نفسانِ صحبتِ ما   رفتید ولے نہ از دلِ ما

مجلس احباب دل میں گرم ہے، دل میں اس کی گرمی ہے

ز چشم مستِ تو مستم شراب را چہ کنم   ز تابِ حسن تو سوزم کباب را چہ کنم

دیکھیے اس ہفتہ میں مولانا کی یاد کس کس طرح تازہ ہوئی آپ کے الطاف نامہ سے، مولوی سید سلیمان کے خط سے، ایک جلد سوانح شبلی کی ختم ہوئی۔ ایک نادر نسخہ رباعیات سحابی نجفی کا ہاتھ آیا۔ مولانا کا نسخہ یاد آیا، ندوہ سے اس کی بابت خط و کتابت کی۔ جواب کیلئے بڑا سا صفحہ انتخاب کیا تھا سب ختم ہو گیا لکھا کچھ بھی نہیں محبت نامے نے شوق ملاقات کی سوزش میں اشتعال پیدا کر دیا ہے۔ دل میں بیتابی ہے کہ ملاقات ہو جو صحبت گذشتہ کی گرمی تازہ کرے حیاتِ تازہ بخشے، سوال یہ ہے کہ کہاں ہو؟ ملا صاحب سلام شوق پیش کرتے ہیں اور کونین بروزن زوجین کے ذکر میں دوسرا جزو بڑھاتے ہیں کہ دو بجے شب کو دودھ لانے کا حکم ہوا تھا تعمیل ہوئی تھی۔

والسلام بالاکرام

حبیب الرحمٰن

۱۹- اے بالی گنج، کلکتہ

۲۹ر ستمبر ۱۹۴۰ء

صدیق مکرم

سفر سے واپس ہوا تو ڈاک میں صحیفۂ مودّت ملا طبیعت تھکی ہوئی اور ہجومِ اشغال سے بے کیف تھی، لیکن آپ نے پچھلی صحبتوں کی یاد تازہ کرکے ساری تھکن بھلا دی

وحدثتنی یا سعد عنها فزدتنی
جنوناً فزدنی من حدیثک یا سعد!

فیضیؔ کا کیا خوب مطلع آپ نے یاد دلا دیا۔ اب بھلانا چاہتا ہوں مگر نہیں بھلا سکتا

اے ہم نفسانِ محفلِ ما　　　رفتید ولے نہ از دلِ ما

کاش، خط کی جگہ ہم نشینی و ہم زبانی کا موقعہ نکلتا۔ اگر گذری

ہوئی محفلوں کو واپس نہیں لا سکتے تو کم از کم ان کی یاد میں اپنی سوگواریوں
کی ایک نئی محفل غم تو برپا کر سکتے ہیں

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رُوبرو کرتے
ہم اور بُلبُلِ بیتاب گفتگو کرتے

آپ لکھتے ہیں جو خط صبح دوران چائے نوشی میں لکھا گیا تھا، وہ عین مجلس چائے نوشی میں پہنچا اور پڑھا گیا ــــ سبحان اللہ! تشنہ کامانِ محبت کے جاذبۂ شوق کا تصرف۔ جو نامۂ اشتیاق "گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم" کے عالم میں لکھا گیا تھا، اگر عین بزم قدح نوشی میں نہ پہنچتا تو کب پہنچتا؟ امید ہے میرے نفسہائے سرد نے مل کر چائے کے جرعہ ہائے تند و گرم کو گوارا کر دیا ہو گا۔ گوارا تر بادا!

مے خور بہ شعر بندہ کہ دل تنگیت مباد
بعد از تو خاک بر سرِ اسباب دنیوی

آپ نے ایک بات کیا خوب لکھی ہے۔ خلوص سدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمت ابدی ہے۔ کیا کہوں اس جملہ نے دل پر کیا اثر کیا۔ اس کلمہ حق کی شرح میرے دل دردمند

سے پوچھیے۔ اکاون برس کی عمر ہو چکی، چند ماہ بعد باون برس پورے ہو جائیں گے گویا انگریزی محاورہ میں کہہ سکتا ہوں کہ پچاس کے "رانگ سائڈ" میں پوری طرح آ چکا۔ عام طور پر لوگوں کی ہوش و آگہی کا زمانہ بیس بائیس برس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ مبدء فیاض کی بخشش خاص نے تیرہ چودہ برس کی عمر ہی میں اس مرحلہ سے مجھے گذار دیا تھا۔ اس طرح گویا ایک کم چالیس برس ہوش و آگہی کے گذر چکے۔ اس چالیس برس کے اندر کارفرمائے غیب کی دستگیریوں نے صدیوں کی مسافتیں طے کرائیں۔ صورت و معنی کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو گا جس سے طلب نے تغافل اور آگہی نے پہلو تہی کی ہو اور فکر و عمل کی شاید ہی کوئی بلندی و پستی ہو گی جس کی پیمائش میں قدم نے کوتاہی اور ہمت نے کم جوشی روا رکھی ہو لیکن اگر آپ پوچھیں کہ مدت العمر کی اس جہاں نوردی کے بعد زندگی کی حقیقتوں میں سے کیا ہاتھ آیا تو بلا تامل کہوں گا کہ دو باتوں کے سوا تیسری بات کہیں دکھائی نہ دی۔ ایک تو یہ کہ زندگی بغیر مقصد کے بسر نہیں کی جا سکتی، اس لیے کسی نہ کسی مقصد کی لگن ضرور ہونی چاہیے

دوسری یہ کہ زندگی کے تمام لذائذ و تمتعات ہیچ ہیں۔ حکایت تشنہ و سراب سے زیادہ نہیں، ہاں اگر عیش حیات کی یہاں کوئی حقیقت ہے تو صرف اس میں ہے کہ دو دلوں میں اخلاص و محبت ہو جو لمحے بھی اس کے میسر آجائیں، زندگی کا حاصل اور عیشِ دنیا کا سرمایہ ہے۔

ہر آں کو خاطرِ مجموع و یارِ ہم نشیں دارد
سعادت ہمدم او گشت و دولت ہم قریں دارد

کبھی شب میں چند لمحے فرصت کے میسر آجاتے ہیں تو ریڈیو میں طہران کی مجلس ساز کے چند آہنگ سن لیتا ہوں کہ کامل معنوں میں سرودِ ہمسایہ کے حکم میں داخل ہیں۔ کل رات کو نو بجے طبیعت بہت بے کیف ہو رہی تھی۔ کاغذات کے انبار کو اپنی طبیعت کی طرح پریشان و منتشر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ریڈیو کر چھیڑا تو احمد تبریزی لسان الغیب کی یہ غزل اپنے آہنگ تازہ میں گا رہا تھا

زدلبرم کہ رساند نوازشِ قلمے　　کجاست پیکِ صبا گو بیا کن کرمے

حدیثِ چون وچرا دردِ سر دہد ساقی
پیالہ گیر و بیاسا ز عمرِ خویش دمے
بیا کہ وقت شناساں دو کون بفروشند
بیک پیالۂ صافی و صحبتِ صنمے

وقت کے تصادفات کا کرشمہ دیکھئے۔ بعینہٖ یہی غزل آج سے تیئیس برس پہلے ایک بزمِ اُنس میں سنی تھی اور کہاں سنی تھی۔ بغداد کی شبِ ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر:

عیونُ المھٰی بین الرصافۃ والجسر!

مرزا محمد کاظم رشتی نے کہ اعیانِ بوشہر میں سے تھے اور زیورِ فضل و دانش سے مجلی اپنی کشتی میں یہ مجلسِ طرب ترتیب دی تھی ایک تازہ وارد مغنّی نے کہ مشہدی کے نام سے مشہور تھا۔ عود پر اپنا کمال دکھایا تھا۔ کیا عرض کروں دل پر کیا گذری۔ حافظ کی یہ غزل حسبِ حال اشعار اور تیئیس برس پہلے کی بچھڑی ہوئی دنیا کا تصوّر ایک عجیب عالم طاری ہو گیا۔ عراق کی گذری ہوئی صحبتیں ایک ایک کر کے سامنے آ گئیں، پچھلی صفیں اُلٹ چکی تھیں مگر پھر بھی خال خال

اصحاب فضل و کمال موجود تھے جن کے سانچے اب موجودہ دنیا کی مٹی سے نہیں ڈھالے جا سکتے۔ شیخ العصر محمود شکری، آلوسی زادہ شیخ ابوحمزہ کردی، سید عبدالرحمٰن نقیب، سید فضل اللہ اصفہانی، شاعرِ عراق جمیل صدقی الزہادی، سید صدرالدین عالمی، سید محمد کاظم طباطبائی، اخوند ملا محمد کاظم خراسانی، مرزا محمد حسین دانش ان میں سے ہر فرد اپنی اپنی خصوصیات میں فرد تھا۔ افسوس ایک ایک کرکے سب رخصت ہو گئے۔ وہ کیا رخصت ہوئے اس عہد کی ساری باتیں ہی خواب و خیال ہو گئیں، ہا، کیا زمانہ تھا اور کیا اس عالمِ رنگ و بو کی جلوہ طرازیاں تھیں، میری عمر بیس اکیس برس کی ہو گی۔ عہدِ شباب کے ولولوں سے دل کا ایک ایک ریشہ معمور تھا جس منظر کو دیکھتا تھا، جنت نگاہ تھا جس نوائے ہستی کو سنتا تھا، فردوسِ گوش تھی۔ عراق کے قیام کے یہ چند مہینے اب چند لمحوں سے زیادہ محسوس نہیں ہوتے

شہور ینقضین وما شعرنا
بانصاف لھن ولا سرار!

فاما لیلهن فخیر لیل
والطیب مایکون من النہار

اس کے ابتدائی دو شعر بھی آپ کو یاد دلادوں کہ کسی نے نوکِ نشتر سے صفحۂ دل پر کھود دیئے ہیں۔

اقول اصاحبی والعیس تھوی
بنا بین المنیفة فالضمار

تمتع من شمیم عرار نجد
فما بعد العشیة من عرار

دیکھئے رشتۂ خیال کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ ان شعروں نے حضرت شیخ آلوسی زادہ رحمۃ اللہ علیہ کی یاد پھر تازہ کردی۔ میں نے علوم عربیہ میں ان سے بڑھ کر کسی کو صاحب رسوخ واحاطہ نہیں پایا۔ ادب عربی کے حافظ بھی تھے اور ناقد بھی تھے، تاج سبکی نے طبقات میں امام ذہبی کی نسبت جو کچھ لکھا ہے، وہ ادب عربی کے معاملہ میں ٹھیک ٹھیک ان پر راست آتا ہے۔ وھو رحل الرجال فی کل سبیل کانما جمعت الامة فی صعید

واحد نظیر تھا ایام و اشعار عرب کی پوری دنیا ان کے دماغ میں سمٹ آئی تھی، جس گوشے کو جب چاہتے تھے دیکھ لیتے تھے ایک دن مجلس مذاکرہ میں ان اشعار کا تذکرہ ہوا۔ میں نے عرارِ نجد کی نسبت سوال کیا، فوراً انواشعار مختلف شعراء اور عہدوں کے سنا دیئے جن میں عرار کا ذکر کیا گیا ہے۔ دیوان سے اُٹھے تو شیخ ابوحمزہ نے کہ حماسہ کے حافظ تھے، راستہ میں کہا، ہماری ساری عمر اسی وادی میں بسر ہو چکی ہے، لیکن دو شعر سے زیادہ حافظہ میں نہیں تھے۔ تم نے دیکھا کہ شیخ کے نظر و احاطہ کا کیا حال ہے

یہ وہی بزرگ ہیں جنھوں نے اورینٹل کانگرس کی فرمائش سے عرب جاہلیت کی مبسوط تاریخ تین جلدوں میں لکھی تھی۔ بلوغ الارب پہلے بغداد میں چھپی تھی پھر مصر میں بھی چھپ گئی۔ ان ہی کے بھائی شیخ نعمان آلوسی زادہ تھے۔ انھوں نے جلا العینین فی محاکمۃ الاحمدین لکھی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے مصر میں چھپوائی۔ ان کے والد شیخ شہاب الدین آلوسی مفتی بغداد کی تفسیر روح المعانی مشہور ہے۔

انکے خاندان سے میرے خاندان کا پہلا رشتہ کچھ عجیب طرح کے حالات میں قائم ہوا تھا۔ والد مرحوم جب سنہ ۱۲۹۳ھ میں عراق گئے تھے تو سیّد عبدالرحمٰن نقیب مرحوم کے والد سید علی رحمۃ اللہ علیہ سجادہ نشین تھے۔ ان ہی کے یہاں ٹھہرے۔ شیخ آلوسی کا انتقال ہو چکا تھا، مگر ان کی مصنّفات کے قلمی نسخے سیّد کے خاندان میں متداول تھے اور بڑی عزّت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سید مرحوم نے شیخ کی تفسیر روح المعانی بڑے فخر و مباہات کے ساتھ دکھائی کہ ہمارے شیخ کی تصنیف ہے۔ شیخ آلوسی اگرچہ بظاہر شاہ راہ عام سے الگ نہیں ہوئے تھے کہ عہدۂ افتا اور رجوع عام کا علاقہ دامن گیر تھا مگر دراصل سلفی المشرب تھے اور تقلید کی بندشیں بہت کچھ ڈھیلی ہو چکی تھیں چنانچہ تفسیر میں کہیں کہیں اس کی جھلک صاف نظر آجاتی ہے والد مرحوم حنفیت اور اشعریت میں بڑے ہی شدید تھے۔ ان کی نظر اس معاملہ میں کب چوکنے والی تھی، ایک دن عین مجلس دیوان میں کہ شیخ نعمان آلوسی زادہ بھی موجود تھے، سیّد علی مرحوم نے پوچھا، "آپ نے شیخ کی تفسیر کو کیسا پایا؟" والد مرحوم نے بلا تامّل کہا خوب ہے، مگر

کہیں کہیں وہابیت اور اعتزال کی بو مجھے محسوس ہوئی۔ یہ بے پردہ ایراد تمام مجلس پر گراں گذرا۔ خصوصاً شیخ نعمان پر اور صحبت نے مجلس مباحثہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ شیخ آلوسی نے حیاتِ خضر سے انکار کیا ہے، والد مرحوم نے سب سے پہلے اس کا تعقّب کیا پھر تفسیر کے تمام ایسے مقامات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے اور ایک رسالہ تعقبات میں تصنیف کر کے شیخ نعمان کو بھیجا۔ شیخ نے اس کے جواب میں ایک مکتوب لکھا۔ والد مرحوم نے جواب الجواب لکھ کر اس مکتوب کو بھی مع اپنے جواب کے رسالہ کے آخر میں شامل کر دیا۔

مرحوم سید عبدالرحمٰن نقیب نے مجھے وہ اطاق دکھایا تھا جہاں والد مرحوم بیٹھ کر لکھا کرتے تھے نیز حرم کا وہ حصّہ جہاں والدہ مرحومہ ٹھیری تھیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا اصل رسالہ بھی روح المعانی کے قلمی نسخے کے ساتھ کتب خانہ میں موجود تھا۔

سید مرحوم کے تفرس نے پہلی ہی ملاقات میں تاڑ لیا تھا کہ میرے خیالات کی رفتار دوسری ہے۔ مجھے دوسرے دن شیخ سے ملایا تو

یوں تقریب کی کہ تمھیں شیخ خیرالدین ہندی یاد ہیں جنھوں نے شیخ کبیر (یعنی شیخ آلوسی) کی تفسیر پر تعقبات کیے تھے۔ یہ ان ہی کے فرزند ہیں، لیکن مجھے ان سے وہی بو آئی جو ان کے شیخ نے تمھارے شیخ کی تفسیر میں سونگھی تھی۔

کیا عرض کروں کہ کس محبت و شفقت کے ساتھ ملے، معانقہ کیا۔ پیشانی چومی۔ میں نے حجاز کے آدابِ تعظیم کے مطابق کہ بچپن سے اپنے گھر میں اس کا عادی ہو گیا تھا، ان کے گھٹنوں کو بوسہ دینا چاہا تو فوراً گھٹنے ہٹا لیے اور باز رکھنے کے لیے پکڑ لیا۔ اس کشمکش میں سر تو ان کے گھٹنوں تک نہ پہنچ سکا لیکن پگڑی ان کے قدموں پر گر گئی اور بے اختیار حافظ کا یہ شعر یاد آ گیا:

اے خوش آں عاشقِ سرمست کہ بر پائے حبیب
سر و دستار نداند کہ کدام اندازد

بار بار فرماتے تھے "من این اخذت ھذا المشرب؟"
ہمیں یہ راہ بزرگوں سے ملی اور چل کھڑے ہوئے تمھیں تو خود ڈھونڈھ کر سراغ لگانا پڑا۔

والد مرحوم نے کئی بار عود کا عطر شیخ لقمان مرحوم کو بھیجا تھا انھیں یہ بات یاد تھی، مجھے دیکھتے تو فرماتے "عود مندل کی خوشبو تم سے آتی ہے۔" (یہ مندل "کارومنڈل" کی تعریب ہے کہ ہندوستان کا جنوبی ساحل اس نام سے مشہور تھا)

۱۹۱۲ء میں میں نے جب الہلال نکالا تو انھیں نہیں بھیجا کہ اردو کا پرچہ کیا بھیجوں، لیکن مصر کے اخبارات میں جب اس کا ریویو ان کی نظر سے گذرا تو مجھے شکایت کا خط لکھا۔ سرنامہ ابن الفارض کا یہ مطلع تھا۔

قلبی یحدّثنی بانکَ متلفی،

روحی فداکَ عرفتَ ام لم تعرفِ

دیکھیئے آپ کی صدائے دل نواز نے دل ہزار شورش کے ساتھ کیا کیا جدید آداب مکاتبت سے قطع نظر کر کے کاغذ کے دونوں صفحے سیاہ کرتا رہا، پھر بھی پانچ ورق ختم ہو چکے اور شوق مخاطبت ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لیتا

بہ صد دفتر نمی گنجد حدیث درد مشتاقے

ہر چند چاہتا ہوں قلم روکوں مگر روک نہیں سکتا۔ دماغ میں تھا

کا پردہ بن گیا ہے۔ ایک تصویر ہٹتی ہے تو دوسری نمودار ہو جاتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ صحبت ختم نہ ہو۔ ایک ذکر ختم ہو جائے تو دوسرا چھیڑ دوں۔

قدرے گریم و ہم بر سر افسانہ روم

دیکھئے کب ملاقات ہوتی ہے۔ وقت کے سیاسی حالات ایسے ہو رہے ہیں کہ کہہ نہیں سکتا کل کیا صورت پیش آجائے۔ اگر حالات کی رفتار ایسی نہ ہوتی تو یقین کیجئے دل آرزومندی کی شورشوں کا یہ حال ہے کہ کلکتہ سے اٹھتا اور سیدھا بھیکم پور پہنچ کر آپ سے بغل گیر ہوتا۔

وابرح ما یکون الشوق یوماً
اذا دنت الخیام من الخیام!

مُلّا صاحب کے سلام شوق سے بہت جی خوش ہوا۔ میرا بھی سلام انھیں پہنچائیے اور ان کے حافظہ کی داد دیجئے۔ صفحہ ختم ہو گیا ورنہ اس دو بجے کے دودھ کی سرگذشت سناتا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابوالکلام

حبیب گنج - علی گڈھ۔

۱۳؍اکتوبر ۱۹۴۰ء

مکرم حبیب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ -

قندِ مکرّر کا شکریہ مکرّر- ڈرتا ہوں کہ مبالغہ نہ سمجھا جائے پھر کہتا
صحیفۂ ثانیہ
ہوں کہ میں سچ کہتا ہوں اور سچ کے قدرداں کے سامنے کہتا ہوں۔ پھر ڈرنا کیسا؟ آپ نے یہ خط لکھ کر دل میں ایک عالم پیدا کر دیا کیا کہوں، ایک بار پڑھا، اسی محبت میں دوبارہ پڑھا، تیسری مرتبہ آواز سے پڑھا، ایک نکتہ سنج ادیب کو سنایا۔ ہر بار کے پڑھنے میں یہ عالم تھا کہ دل کسی مخلص کے معانقے کی گرمی کا لطف محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں پُرنم تھیں۔ چوتھی مرتبہ اس وقت پڑھا کہ جواب لکھنے بیٹھا

لہ ماسٹر سید منظر علیم فریدآبادی، بی۔ اے مرحوم جلیس نواب صدر یار جنگ بہادر۔

ہوں، گرمیِ تحریر کی تاثیر دیکھیئے کہ آپ کے ہر واقعہ نے جو زیبِ قلم ہوا، مجھ کو بھی اسی کے مطابق دل فروز واقعہ یاد دلایا۔

شروع میں یہ شعر زیب رقم ہوا ؎

یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

مجھ کو یاد آیا کہ علی حزیں نے لکھا ہے کہ ایک موقعہ پر جب اُن کا دل محبت کا نشتر خوردہ تھا، ایک شب اصفہان کی کسی صحبت میں جو باغ میں تھی، علی کوساری نے ساز درست کر کے یہ شعر سنایا ؎

امشب بیا تا در چمن سازیم پُر پیمانہ را
تو شمع و گل را داغ کن من بلبل و پروانہ را

صبح تک یہی نغمہ تھا۔ اس شعر کو گاتا، چُپ ہو جاتا، پھر گاتا پھر چپ ہو جاتا حزیں کہتا ہے کہ معلوم نہیں کتنی مرتبہ سلطانِ روح نے قالب خالی کیا تھا۔ میں نے جس عالم میں یہ واقعہ پڑھ کر لطف لیا تھا، وہ آپ کے شعر بالا سے تازہ ہو گیا۔

آپ نے بغداد کا ذکر چھیڑا، مجھ کو وہ وقت یاد آگیا جب "دنورحوالی" بوالکلام

آزاد اور ابوالنصر آہ نمایاں ہوئے تھے۔ امرتسر سے وکیل اخبار منشی غلام محمد مرحوم کی ادارت میں شان و وقار کے ساتھ نکلتا تھا اس میں آپ کے مضامین ہوتے تھے جو اس وقت بھی لطفِ کلام اور خوبیٔ معانی کے جوہر سے آراستہ ہوتے تھے۔ اسی سلسلہ میں یہ سُنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔ بغداد کی روئداد آپ نے اب سنائی

ریڈیو نے احمد تبریزی کا آہنگ تازہ سنا کر آپ کو یادِ بغداد میں محو کر دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ حافظ کی جس غزل

ز دلبرم کہ رساند نوازش قلمے

کے ریڈیو پر سننے سے ۳۲ برس ادھر کی صحبت آپ کو یاد آئی اسی غزل نے مجھ کو کیا یاد دلایا۔ آپ نے غزل کے تین شعر نوازش نامہ میں نقل کیے تھے میں نے پوری غزل دیکھنے کے لیے حافظ کا دیوان نکلوایا۔ وہ نسخہ ہاتھ میں آیا جو ملک التجار نے ایرانی خط میں چھپایا تھا۔ آج سے چالیس برس پہلے یہ نسخہ زیرِ مطالعہ رہا تھا۔ جا بجا انتخاب کے نشان کیے تھے۔ اب جو یہ غزل نکالتا ہوں تو اس پر انتخاب کا نشان موجود پاتا ہوں۔ دل پر اس توارد و تصادف سے عجب عالم طاری

ہوا۔ آپ کو دجلہ کی مواجی اور شب ماہ کی تابش یاد آئی۔ مجھ کو خود اپنی طبیعت کی مواجی اور تلاطم نے بیتاب کر دیا۔ کیا کہوں کیا عالم تھا اور کس کے اثر سے تھا۔ اجمالاً اس عالم کی شرح نگار ایک غزل ہے جو اسی کیف میں موزوں ہوئی تھی ؎

زجام لعلِ تو مستم شراب راچہ کنم
خوشم بسوزِ دلِ خود کباب راچہ کنم

یہ مطلع خواجہ آصفی کا ہے اسی طرح پر میں نے غزل عرض کی تھی

زچشم مستِ تو مستم شراب راچہ کنم
زتاب حسنِ تو سوزم کباب راچہ کنم

حدیث دوست بگوشم رسد زپردۂ دل
حکایتِ نے وصوتِ رباب راچہ کنم

نہ کردہ جلوۂ بُت شوخ و باختم دل و دیں
اگر براِفگند از رُخ نقاب راچہ کنم

حسب عادت غزل علامہ شبلی مرحوم کے ملاحظہ میں پیش کی گئی۔
حیدرآباد سے ۱۹ دسمبر ۱۹۰۱ء کو تحریر فرمایا خدا کی قسم غزل کی غزل

مرقع ہے اور یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کا ہے "اگر برافگند از رُخ" الخ
دیکھئے ۳۲ اور چالیس سال کے گذرے ہوئے دو واقعے کس طرح
متصادف ہو گئے۔ یہ خلوص ذوق کا کرشمہ ہے۔ آپ کو بہت سے اہل
کمال یاد آئے تھے مجھ کو ایک علّامہ کی یاد نے محوِ ذوق بنا دیا۔

ولیس للّٰہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

رحمت باد بر شبلی، نعمت بر آزاد!

حدیثِ تازہ گویم

چوتھا یا پانچواں دن ہے۔ ایک شب کو تراویح کے بعد عنبری سبز
چاء کا دور تھا۔ چند ہم مشرب جمع تھے۔ مُلّا صاحب بھی تھے۔ لسان الغیب
کو زحمتِ قدوم دی گئی۔ سرورق غزل نکلی ؎

معاشراں گرہ از زلف یار باز کنید
شبے خوش است بدیں صلہ اش دراز کنید

(دیکھئے، زلفِ معنبر اور چاء عنبری کا وصلہ کیا خوب ہوا۔ شب
کی خوشی دوبالا ہوئی۔)

حضورِ خلوتِ انس است و دوستاں جمع اند

وان نکاد بخوانید و در فراز کنید
نخست موعظہ پیرِ صحبت ایں حرف است
کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید
بر آں کسے کہ دریں حلقہ زندہ نیست بعشق
برو چو مردہ بفتوائے من نماز کنید الخ

غزل مکرر پڑھی گئی، حیرت تھی کہ لسان الغیبی کا پورا جلوہ دکھا رہی تھی۔ تراویح کے بعد دوسری نماز کا فتویٰ خاص لطف دے گیا۔

جو گناہ آپ سے سرزد ہوا تھا، میں نے عمداً اس کا ارتکاب کیا۔ دونوں صفحے بھر دئیے۔ کاغذ کا قحط ہے۔ کلکتہ کی ایک تعمیل کنندہ فرم دانت دکھا گئی۔

مُلّا صاحب کے سلام پر ختم کلام۔ مگر صد سخن باقی۔

حبیب الرحمٰن

۱۹- اے، بالی گنج، سرکلر روڈ کلکتہ

۲۶ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

صدیق مکرم

تعلیقۂ گرامی میں صرف الفاظ ہی نہ تھے خوشبو بھی تھی، آنکھیں سوادِ خط سے خورسند ہوئیں۔ دماغ نے محبتِ بے ریا اور خلوص اہل صفا کا عطر سونگھا۔ انفلوئنزا کی شدت سے سر قابو میں نہ تھا جسم بے حال ہو رہا تھا۔

زبینائی سرم می گردد و بالیں نمی یابد

مگر آپ کی صدائے محبت نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اب تکیہ کے سہارے یہ سطریں لکھ رہا ہوں۔

ز نسیم جاں فزایت دل مردہ زندہ گردد

زکدام باغ اے گل کہ چنیں خوش ست بویت

آپ نے شیخ علی حزیں کا واقعہ کیا خوب یاد دلایا۔ اسی عالم میں اس نے غزل لکھی تھی۔

بجرمِ عشق اگر کشتی مرا ممنونِ احسانم
گناہ زاہد بیدُ دیارب چیست جرانم

کتابِ عشق لوحِ دل بود در مکتبِ ہستی
نکو کردی بسطرتن کشیدی خط البطلانم

شیخ کو سوز و تپش کی جو دولت میسّر آئی تھی، الحمد للہ اس نامراد کا دامنِ نیاز اس سے مہینوں سرمایہ اندوز رہا۔ بلکہ کہنا چاہیئے کم و بیش دو سال تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی تھی۔

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی
یاں عمر کٹ چکی ہے اسی اضطراب میں

اس زمانے میں سماع کی کیفیتوں اور شورش انگیزیوں کے جو واردات و سوانح تجربے میں آئے بقول شیخ کے سرتا سر حالی ہیں۔ زبانِ حرف و صوت ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ کسی راہ چلتے فقیر کی ایک صدائے خوش ہی کام کر گئی۔ اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ آگرہ میں گذر ہوا۔ موسمِ بہار کا آغاز تھا اور چاندنی راتیں تھیں۔ ایک دن شام کو جمنا پار کے ایک گوشۂ چمن میں بعض یارانِ ہمدم جمع ہوئے اور تمام شب صحبتِ سوز و ساز جاری رہی۔ ابتدا میں چند چیزیں ہندی اور اردو کی زبانِ نغمہ پر رواں ہوئیں مگر دل کی بیتابیوں کو جوش و خروش میں نہ لا سکیں۔ ناگاہ امیر خسرو کا یہ مطلع پردۂ ساز میں بہ ہزار

دل کشی و رعنائی زمزمہ پردازنہ ہوا۔

جاں زتن بردی و درجانی ہنوز

دردہا دادی و درمانی ہنوز

کیا کہوں اور کیونکر کہوں کہ بمجرد سماع کیا عالم طاری ہو گیا۔ یہ مطلع بارہا پڑھنے اور سننے میں آچکا تھا۔ مگر اس وقت ایسا معلوم ہوا گویا زندگی میں پہلی مرتبہ گوش زد ہوا ہے اور اس کے صاف صاف لفظوں میں جو صاف معانی پوشیدہ ہیں، ان کی حقیقت کا پہلی مرتبہ انکشاف ہوا ہے شیخ نے جو کچھ لکھا ہے، انشاپردازی نہیں ہے۔ حقیقت حال ہے روح نے بارہا کالبد خاکی کو خالی کرنا چاہا مگر پھر اٹک کر رہ گئی۔ باوجودے کہ ایک قرن سے زیادہ زمانہ گذر چکا ہے مگر جو جو لھا ان وقتوں میں گرم ہوا تھا آج تک ٹھنڈا نہیں ہوا۔ انگارے بجھ چکے، مگر خاکستر کریدی جائے تو اب بھی چنگاریاں نکل آئیں گی۔ اس سے زیادہ آپ کو کیا لکھوں کہ الحمد للہ اس کوچہ کے رسم وراہ سے آشنا اور اس دولت معنوی کی بخششوں سے سرمایہ اندوز رہ چکے ہیں۔ والعیان لا یحتاج الی الشرح والبیان۔

ومن بعد هذا ما یدق بیانہ
وما کتمہ احظی لدیہ واجمل

آپ نے اپنی زندگی کے بعض واردات وسوانح کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ مزید کیف و ذوق کا باعث ہوا۔ اور اسی کی تحریک سے مندرجہ بالا سطور بے اختیار نوکِ قلم پر رواں ہو گئیں، ورنہ اس باب میں تکلّم وحکایت اصحاب درد و ذوق کا شیوہ نہیں۔ شاہ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ شاعر نہ تھے مگر ایک شعر کیا خوب کہہ گئے ہیں کہ شاہ عبد الحق محدّث کے وردِ زبان ہو گیا تھا۔ مکاتبات میں بار بار نقل کرتے ہیں

سخن عشق بدل ورنہ ولب را مکشا
سرِ ایں شیشہ فرو بند کہ بادے نہ خوسو

"سرِ ایں شیشہ فرو بند" میں کیا قیامت کر گئے ہیں۔

شیخ کے تذکرے نے اپنی طبیعت کا ایک خاص تاثر یاد دلا دیا میں نے جب پہلے پہل ان کی خود نوشتہ سوانح عمری پڑھی تھی تو ان کے اوضاع وروش سے طبیعت بیحد متاثر ومالوف ہوئی تھی اور ایک طرح کا خاص لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ملنے کی کوئی تاسفت ان کے علوِ طبع، عزت

نفس اور خود داری و نامرادی پر غالب نہ آسکی۔ یہ اوصاف حمیدہ اگرچہ بحد غرور و کبر پہنچ جائیں، بہرحال ذلتِ نفس اور دنائتِ طبع کے خصائل رذیلہ سے بدرجہا افضل و راجح ہیں۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ شیخ نے ہندوستان اور اہل ہند کی ہجو میں جو کچھ کہا تھا مجھے اس کا بھی کوئی گلہ نہ تھا۔

نسناس سیرتی است تمنائے مردمی
از دیو لاخ ہند کہ آدم نداشتہ ست

اب بھی دیکھتا ہوں تو طبیعت میں یہ تاثر بدستور باقی ہے۔ شیخ کے متعدد رسائل ہاتھ آئے جنکا تذکرہ میں ذکر کیا ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا پایہ حکمت و معقولات میں بلند تھا اور طبیعت مجتہدانہ نظر و کاوش سے بھی خالی نہ تھی۔ سراج الدین علی خاں آرزو، شمس الدین فقیر اور ٹیک چند بہار وغیرہم کے ان سے معاملاتِ حکایت زاغ و بلبل کا حکم رکھتے ہیں۔

آپ کی غزل پر علامہ شبلی کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہے جو اس عہد میں مل سکتی تھی۔ یہ شعر کتنا رواں اور ڈھلا ہوا نکلا ہے

حدیثِ دوست بگوشم رسد ز پردۂ دل
حکایتِ نے و صوتِ رباب را چہ کنم

اور نقاب کے قافیہ میں تو واقعی ردیف چیخ اٹھی ہے۔

اگر برافگند از رخ نقاب را چہ کنم

علامہ مرحوم کی یاد میں آپ کو کتنا برمحل شعر یاد آیا

ولیس للّٰہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

خواجہ حالی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے

بہت لگتا ہے جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات نبوغ و کمال کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی اور جیسا کہ فارسی میں کہتے ہیں، سرتاسر مغز بے پوست تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینا ایسا گذرتا ہے کہ دو تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بہ دل نہ ہوتی ہو، وہ کیا گئے علم و فن کی صحبتوں کا سرتاسر خاتمہ ہو گیا۔

مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔ والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے

بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔ اس اشتراکِ عادت نے ایک خاص رشتۂ انس پیدا کر دیا تھا۔ جب کبھی یکجائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف و کیفیت کا وقت ہوتا۔ چائے کا دَور چلتا اور علم و فن اور شعر و ادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق و فکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے۔ اور یہ کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود مُلّایانہ طلب علم کے مُلّائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی۔ خشکی طبع جو اس راہ کے مہالک و آفات میں سے ہے، انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ شاعری کے ذوق و فہم کا جو اعلیٰ مرتبہ ان کے حصّہ میں آیا تھا اس کی تو نظیر ملنی دشوار ہے۔ ہندوستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں، ان پر ختم ہوئی۔ کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے، تو ان کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ ہے تغزّل و مدح کے محدود میدانوں میں ہے، لیکن مولانا نے فارسیّت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر و تخیّل کے نئے نئے میدان پیدا کیے، جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں۔ خصوصاً حیدرآباد والی نظم، اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ مولانا

تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوبِ شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔

اس معاملہ کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں جن کی ترتیب و اشاعت میں غریب براؤن نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں خدا ان کے کلام کے مطالعہ کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔

غزل میں تو یقیناً مولانا کے یہاں غالب سے کہیں زیادہ سرجوشی و کیفیت ہے۔ اور حقائق و واردات کے لحاظ سے تو مقام ہی دوسرا ہے مولانا کا ایک شعر سینکڑوں مرتبہ دہرا چکا ہوں، لیکن پھر بھی بے اختیار دل کی گہرائیوں میں سے اُبھر آتا ہے۔

دو دل بودن دریں رہ سخت تر عیبے است سالک را
خجل ہستم ز کفرِ خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

میں جانتا ہوں کہ یہ شعر مولانا ہی کہہ سکتے تھے، کیونکہ اس کا تعلق ایک خاص حالت سے ہے۔ جب تک وہ طاری نہ ہو، اس طرح کی صدا

اُٹھ نہیں سکتی۔ خواجہ حالی مرحوم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اس شعر پر گھنٹوں مجھے خود فراموشی رہی۔

افسوس اب وہ وقت آ گیا کہ ان تذکروں کے لیے بھی کوئی مخاطب نہیں ملتا۔ کہاں جائیے اور کس سے باتیں کیجیے جن سے خطاب تھا وہ سب رخصت ہو گئے۔ ہاں الحمدللہ ایک آپ کی ذات گرامی باقی ہے، لیکن یک جائی میسّر نہیں۔

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور می ماند

بدایونی نے ایک رباعی لکھی ہے، معلوم نہیں کس کی ہے اکثر زبان پر جاری ہو جاتی ہے

افسوس کہ یاراں ہمہ از دست شدند
در پائے اجل یگاں یگاں پست شدند
بودند تنک شراب در مجلسِ عمر
یک لحظہ ز ما بیشترک مست شدند

اب تھک گیا ہوں اور تکیہ پر سر رکھتا ہوں۔ ملا صاحب کو بعد سلام

کہیئے کہ کونین کی گولیاں سامنے دھری ہیں، مگر افسوس کہ آپ نہیں ہیں کہ رات کے دو بجے حلوائی کے یہاں کا دودھ پلائیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

ابوالکلام

حبیب گنج، علی گڈھ

۶ر دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

مکرم حبیب، صدیق حمیم - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

۲۶ر اکتوبر کا گرامی مکتوب یہ ابیش نظر، بلکہ نور نظر رہا - بار بار دیکھا اس وقت بھی پڑھ لیا، دو یادیں تازہ ہوئیں بلکہ تین، ایک عالم سوز و گداز کی حکم ہے - "سراں شیشہ فرو بند!"

لہذا اسی قدر اشارہ کافی ہے - دوسری شیخ علی حزیں کی - میرا خیال آپ کے خیال کے ساتھ طابق النعل بالنعل ہے کجا حزیں، کجا حزیں کے معترضین اہل ہند کو برا بھلا کہا تو کہا

ع ہنر کے دیکھنے والے ہنر کو دیکھتے ہیں

شعر العجم میں علامہ مرحوم نے شیخ کو نہیں مانا - میں نے ٹوکا - ایک بار سے زیادہ بنارس میں مزار شیخ دیکھا ہے اور اس کو غزل

فارسی کا مدفن محسوس کیا ہے۔ تیسری یاد علاّمہ شبلی مرحوم کی۔
آپ کے پُرشوق الفاظ نے آتش شوق تیز کر دی۔ اسی زمانہ میں
ایک طُرفہ اتفاق پیش آیا۔ مدت دراز کے بعد رباعیات سحابی
نجفی کا ایک قلمی نسخہ ہاتھ آگیا۔ رباعیات کے متعلق تلاش شروع
ہوئی۔ کس قدر ہیں، کہاں کہاں ہیں۔ کسی نے یاد دلایا کہ ستمبر ۱۹۳۷ء
میں الندوہ میں مولانا نے ایک مضمون سحابی پر شائع کیا تھا۔ اسی
ضمن میں ایک دوسرے مضمون میں ایک دو آتشہ جام نگاہ شوق
میں چھلک گیا۔ مآثر رحیمی کے طبع ہونے کا شوق ظاہر فرمایا گیا ہے۔
اس ضمن میں چار نام زبان قلم پر آئے۔ چوتھا نام میرا تھا۔ اس عنوان
سے "حبیب صادق" جوش کیف سے جھوم گیا۔ حضرت میر دردؔ کا
شعر یاد آیا کیف دو بالا ہو گیا۔

دونوں جہان کی نہ رہی پھر خبر اُسے
دو پیالے جس کو آنکھوں نے تیری پلا دیئے

مولانا کے دونوں لفظ دو پیالے تھے، بلکہ دو خم، نہیں دو میخانے
آج تک جب یاد آتے ہیں سرشار نیاز کر دیتے ہیں۔

من شیشہ بدل دارم پیمانہ بدل دارم
قربانِ نگاہ تو میخانہ بدل دارم

شبلی کی نگاہ! دل مستِ ذوق کیونکر نہ ہو۔ رحمت الٰہی بروے آپ نے گرامی نامہ میں حضرت امیر خسرو کا ایک شعر واقعۂ آگرہ کے ضمن میں لکھا ہے

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز

دیکھئے ذوق میں ذوق، بات میں بات.... نواب اسحٰق خاں مرحوم کے دورِ سکریٹری شپ میں جو اہتمام کلامِ خسرو کی اشاعت کا ہوا تھا، اس کا سلسلہ اب پھر جاری کیا ہے کچھ فنڈ باقی تھا، پہلے مثنویاں شائع ہوئیں دیوان نہ ہوا۔ اب وسط الحیوٰۃ کو ہاتھ میں لیا ہے مصحح نے چند جزو صحیح کرکے دیئے ہیں، وہ ان دنوں ذوق آفریں ہیں۔ اتفاقیہ چند معاشر بھی ہیں۔ شب کو ایک وقت کچھ کلام پڑھا، سنا یا جاتا ہے۔ ایک غزل پڑھی گئی چھوٹی بحر کی، مگر سوز و گداز کا بحر بے پایاں دو تین شعر سن لیجئے۔ مقطع کا آخری مصرع معلوم نہیں کتنی بار پڑھ چکا ہوں۔ ہر مرتبہ دل بحر نیاز میں غوطہ کھا جاتا ہے اور تازہ دم ہو کر

اُبھرتا ہے

دیوانہ شدم در آرزویت | اے چشم ہمہ جہاں بسویت
ماییم و تحیّر و خموشی | و آفاق ہمہ بگفتگویت
دی روئے تو دیدم و نمردم | شرمندہ بماندہ ام ز رویت
خسرو بکمندِ تو اسیر است | بیچارہ کجا رود ز کویت؟

اللہ اکبر! بیچارہ کجا رود ز کویت؟ زمانہ پلٹے کھا رہا ہے، انقلاب کے سیلاب موجزن ہیں۔ صحبتیں درہم برہم ہو رہی ہیں۔ دستِ اجل کارفرما ہے۔ جو رونق بزم اور نور چشم تھے، زیر خاک جا سوئے۔ اس پر بھی سرسودا زدہ اپنے خیال میں ہے۔ شبلی سے باتیں کرتا ہے شوقِ نیازکو بدستور تازہ پاتا ہے، علیٰ ہذالقیاس جو احباب چلے گئے، ہنوز سرسودا زدہ اور قلب دیوانہ ان کی حضوری محسوس کر رہا ہے۔ ان سے جن چیزوں کو تعلق تھا' وہ اب بھی ویسی ہی عزیز ہیں جیسی ان کی حیات میں تھیں۔ خلاصۂ کلام دائرۂ اخلاص میں بدستور گام زن ہے قدم فرسا ہے۔ کوئی ٹوکتا ہے تو کوئی چیخ اٹھتا ہے

"بیچارہ کجا رود ز کویت؟"

یہ ہے بیچارگی کی قوت تا کرادہند !

دراز آہنگی معاف۔ آپ کا محبّت نامہ پڑھوں، محبّت کی باتیں سنوں اور پھر قلم قابو میں رہے

"ایں خیال است و محال است و جنوں"

ثمّ وعلیکم السّلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

جوشِ شوق نے معذرتِ تاخیرِ جواب نہ لکھنے دی۔ یہ انتظار رہا کہ سفر سے مع الخیر مراجعت ہو تو لکھوں۔ الحمدللہ خبر بخیر رسی کلکتہ پڑھی۔ جواب عرض کر دیا۔

حبیب الرحمٰن

دہلی

۱۶ر فروری ۱۹۴۲ء

وفا کنند کہ بیگانہ آشنا گردد
ترا چہ شد کہ نمی پُرسی آشنائے را

ابوالکلام

حبیب گنج، ضلع علی گڑھ

مورخہ ۲۳ر فروری ۱۹۴۲ء

حبیب نواز، آشنا پرور کرم طراز

السلام علیکم و قلبی لدیکم۔ کل جان پرور نامہ پہنچا۔ دیکھ کر فرطِ شوق سے دل تڑپ گیا۔ زبان سے بے اختیار نکلا۔

بوئے خوشِ تو ہر کہ زبادِ صبا شنید
از یار آشنا سخن آشنا شنید

زیب نامہ صرف ایک سطر تھی، مگر ایک دفتر محبت اس میں بھرا ہوا تھا۔ محبت نہ ہو تو شکوۂ ناآشنائی کیوں ہو؟ جو شکوہ خبر محبت دے اس پر سو شکر قربان

ارشاد ہے تراچہ شد۔ سنیئے چہ شد۔ جب سے سابق روح پرور مراسلت نذرِ تفرقہ ہوئی دل اس تمنا سے لبریز رہا کہ پھر آغاز پذیر ہوئی

ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبحگاہی
بہ پیام آشنائے بنوازد آشنا را

اس تمنا میں نقل و حرکتِ گرامی دیکھتا رہا، جویائے موقع رہا ایک اتفاق۔ حیدرآباد سے واپسی میں وارد ہوا اسٹیشن پر اس وقت پہنچا کہ دس منٹ پہلے تشریف بری ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر سید محمود برسوں میں ملے۔ پھر بھی دل اثر اخلاص سے بدستور نرم و گرم تھے۔ ملے اور خوب ملے۔ بڑی جاں فزا اور روح پرور صحبت رہی۔

ہر جا کہ من و دوست بہم باز رسیدیم
از بیم بد اندیش لب خویش گزیدیم
بے واسطۂ گوش و لب از راہ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

باز آیم بہ مطلب۔ شکر ہے کہ بالآخر نظر آشنائے توجہ ہوئی۔ نصف مکالمت کا موقع ہاتھ آیا۔ اتفاقاً جس وقت ڈاک ملی ایک عزیزہ کی تقریب میں جا رہا تھا۔ ڈاک بدستور رکھ گیا۔ واپس آکر شب کو کھولی، پڑھی، شکوۂ ناآشنائی نے کیا کہوں کیا لطف دیا

کس زبان سے کہوں، کس قلم سے لکھوں۔ ذیب نامہ شعر بار بار پڑھا، ہر بار تازہ لطف پایا۔ ارادہ کیا صبح جواب لکھوں گا۔ لطف ملاقات کا سرور حاصل ہو گا۔ اسی سرور میں آمادۂ خواب ہوا آمد خواب کے کیف میں جانب نیشا پور سے آواز آئی

شب امید بہ از صبح عید می گزرد
کہ آشنا بتمنائے آشنا خفتہ است

کیف دوبالا ہو گیا۔ شب کو جب آنکھ کھلی، یہی آواز جاں نواز رہی، بیداری بھی خواب کی طرح شیریں رہی

ارشاد ہے، "کمی پرسی، حقیقت سنج عرف شیرازی نے جس کے آشنا سنج ہونے کی قسم کھائی ہو، وہ نہ پوچھے" کیوں کہ ممکن ہے

بنام آں جبیب آشنا سنج
کہ در آرائشِ معمورۂ رنج

جیسا کہ اوپر عرض کیا، صرف انتظار موقع تھا، حافظ کا یہ شعر وردِ زبان

همہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبحگاہی   بہ پیام آشنائے بنوازد آشنا را

شکر ہے، موقعہ آیا۔ شکوہ نا آشنائی ہوا۔ بروقت ہوا اور بجا ہوا زندہ باد آزاد۔ "الشیئ بالشیئ یذکر" اس دوران میں اعظم گڈھ سے مسودہ حیات شبلی کے اجزاء آتے رہے، پڑھتا رہا، بھیجتا رہا۔ بے مبالغہ بیک وقت بیسیوں صفحے پڑھے۔ جب رکھے حسرت رہی کہ اور پڑھے ہوتے۔ سرگذشت کا لطف حکایت نے دیا ؎

ہے آج جو سرگذشت اپنی
کل اس کی حکایتیں بنیں گی

دل محسوس کرتا تھا کہ علامہ کی صحبت میں حاضر ہوں، لطفِ صحبت سے مستفید و فیض یاب ہوں، آہ کیا صحبت تھی، کیا فیض تھا، فخر اس میں تھا کہ ہر موقع پر ایک نیاز مند حاضر آتا تھا۔ شبلی و شروانی کی زندگی کچھ اس طرح منوط رہی کہ جہاں علامہ کا فضل نور افشاں ہے وہاں شروانی کی نادانی بھی جلوہ ریز ہے

والسلام ختم الکلام
نیاز نشاں
حبیب الرحمٰن

۱۹ اے - بالی گنج، سرکلر روڈ - کلکتہ

۴ مارچ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم -

میرے ایک نالۂ درد نے آپ کے دل محبت نواز کو ایسا ہلادیا کہ چار صفحوں کا صحیفۂ الطاف و محبت زیب رقم ہوا - شاد کام و منت گذار ہوں -

یک بار نالہ کردہ ام از درد اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدامی تواں شنید

آپ جانتے ہیں، صبح کی چائے کے بارے میں میرا حال وہی ہے جو حاجی محمد جان قدسی کا تھا -

ساقی بہ صبوحی نفسے پیشتر از صبح
برخیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

سفر ہو، حضر ہو، کوئی حالت ہو، اس معمول میں فرق نہیں پڑتا، گویا شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف یہی ایک وقت میرے حصّہ میں آیا ہے۔ قید خانے کی زندگی ایسی ہوتی ہے کہ قدرتی طور پر زندگی کی تمام معمولات درہم ہو جاتی ہیں، میں وہاں پہنچتا ہوں تو انتظار نہیں کرتا کہ تبدیلیاں اپنا تقاضہ شروع کریں، خود بدل جاتا ہوں اور کوشش کرتا ہوں کہ وہاں کی تبدیلیوں کا پوری طرح ساتھ دوں، لیکن صرف ایک چیز اس سے مستثنیٰ ہوتی ہے، صبح چار بجے کی چائے یہ کمبخت وہاں بھی نہیں چھوٹتی۔

لذّتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ

خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی!

نینی سنٹرل جیل میں برابر یہ معمول رہا کہ صبح تین بجے اُٹھتا، پانی کی کیتلی اسٹوو پر رکھ دیتا اور غسل کے لیے چلا جاتا۔ واپس آتا تو پانی اُبل اُبل کر اپنی تیاری کا اعلان کرتا، بلا توقف چائے دانی میں چائے دم دیتا اور پھر جام و صراحی کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیتا۔

حاصلِ کارگہ کون و مکاں ایں ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں ایں ہمہ نیست
پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داریم
خوش بیاسائے زمانے کہ زماں ایں ہمہ نیست

اس عالم میں کئی بار آپ کی یاد بھی آئی اور بے اختیار آئی۔

اے نسیم سحری یاد دہش عہد قدیم!

ایک مرتبہ خیال ہوا، آپ کو کچھ لکھوں، آپ کے آخری خط کے جواب کا قرض بھی باقی تھا۔ لیکن پھر غور کیا تو نینی سنٹرل جیل اور حبیب گنج کی باہمی مسافت اتنی دور دراز کی مسافت دکھائی دی کہ ہمت نہ پڑی۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو امام مسلم نے مقدمہ میں عبداللہ بن مبارک کا قول حجاج بن دینار کے رفع کی نسبت نقل کیا ہے "بینہما مفاوز، تنقطع فیہا اعناق المطی" ایسی ہی مسافت میں نے بھی دیکھی کہ سامنے ہے۔

قلل الجبال، و بینہن خیوف

رہائی کے بعد حالات نے دم لینے کی مہلت نہ دی۔ صحت بھی

تغافل کرتی رہی، لیکن جب پچھلے سفر میں لاہور لوٹتے وقت دہلی ٹھہرا تو دہلی کی پچھلی صحبتوں کی یاد کے ساتھ آپ کی یاد بھی آئی اور اس طرح آئی کہ ضبط نہ کر سکا۔ دل کی صدائے درد زبان تک پہنچی اور زبان نے نوکِ قلم کے حوالہ کیا

ترا چہ شد کہ نمی پرسی آشنائے را

وہی صبح چار بجے کا وقت تھا، آصف علی صاحب کی کوٹھی کے ایک کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک حکیم صاحب مرحوم کی یاد تازہ ہو گئی۔ ان کی یاد دہلی کے ساتھ اس طرح وابستہ ہو گئی ہے کہ یہ لفظ بغیر انہیں یاد کیے نہیں بول سکتا۔ دل کے بہت زخم ہیں جو امتدادِ زمانہ سے داغ بن کر رہ گئے ہیں۔ ع

اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

لیکن یہ زخم اب تک نہ بھر سکا

جوشید خون تازہ ز داغ کہن مرا،

پھر ان کی یاد کے ساتھ وہ تمام صحبتیں ایک ایک کر کے سامنے آ گئیں جو ان کے دم سے گرم رہا کرتی تھیں اور وہ تمام حریفانِ محفل

جو ان تمام صحبتوں میں ہم نفس و ہم آہنگ رہا کرتے تھے، ایک پوری مجلس نگاہوں کے سامنے پھر رہی تھی۔

مجنوں بہ ریگ بادیہ غمہائے خود شمرد
یاد زمانہ کہ غمِ دل حساب داشت

غم صرف اسی کا نہیں کہ یہ لوگ جدا ہو گئے، غم اس کا ہے کہ وہ دنیا ہی مٹ گئی جس دنیا کی یہ لوگ مخلوق تھے۔ اب نہ وہ دنیا واپس آسکتی ہے نہ وہ صورتیں اور سیرتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہم اس کاروانِ رفتہ کے چند پسماندگانِ راہ رہ گئے ہیں۔ جنھیں نہ تو قافلہ کا سراغ ملتا ہے، نہ منزل سے آشنا ہو سکتے ہیں، نہ ہمیں کوئی پہچانتا ہے نہ ہم کسی کے شناسا ہیں۔

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابم
جہاں چوں نرگستاں بے تو چشم کور می باشد

کیا عرض کروں، وردھا کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو سکنے کا کس درجہ افسوس ہوا۔ آج کل نظم و نسق کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو رہا ہے۔ کوئی ٹرین وقت پر کلکتہ نہیں پہنچتی۔ کمبخت کلکتہ میل

کو اسی دن وقت پر پہنچنا تھا۔ آپ سے ملاقات کا معاملہ میرے لیے وہی ہو گیا ہے جو غالب کو پیش آیا تھا۔

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکہ ہو؟

معلوم نہیں ادھر دہلی جانے کا کوئی موقعہ نکلتا ہے یا نہیں، لیکن اگر نکلے اور میں آپ کو اطلاع دوں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک دو دن کے لیے آپ بھی اس خرابہ میں آنکلیں۔ میں نے دہلی کو ایک خرابہ کہا، حالانکہ وہاں ایک نیا شہر آباد ہو چکا ہے

بایک جہاں کدورت بازایں خرابہ جائے ست

والسلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

ابوالکلام

۱۹ اے بالی گنج، سرکلر روڈ کلکتہ

۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

پچھلے خط کے جواب سے آپ نے شاد کام نہیں فرمایا۔ مانع بخیر ہو۔

شراب لطف پر در جام می ریزی و می ترسم
کہ زود آخر شود این نشہ و من در خمار افتم

ابوالکلام

۲۴ر اپریل سنہ ۱۹۴۲ء

شراب لطف من دارم خُم اندر خُم چہ می ترسی
نہ زود آخر شود ایں نشہ و نے در خمار افتی

مکرم جبیب صدیق حمیم - السلام علیکم و رحمۃ اللہ

۱۹ر کا لطف نامہ آگیا - فللّٰہ الحمد مانع بخیر ہے - سابق گرامی نامہ اور اس کا جواب دونوں برابر پیش نظر رہے - آپ کی گراں مصروفیت اور اس کے سلسلہ میں مسلسل نقل و حرکت بھی سامنے تھی اس لیے مخل اوقات بننے کی جرأت نہ ہو سکی - اب انشاء اللہ جواب عرض ہوگا - اس وقت رفع گرانی کے لیے یہ چند الفاظ ارسال خدمت کر رہا ہوں - عافیت سامی کی دلی تمنا ہے - نیاز کیش

حبیب الرحمٰن

کلکتہ

۴ر مئی ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

حسب حالے نہ نوشتیم و شد ایامے چند

کل الہ آباد سے تھکا ماندہ واپس آیا تو طبیعت بہت بے کیف تھی۔ حسب معمول دوپہر کو کوئی کتاب لے کر لیٹنا چاہا تو ابوطالب کلیم کا دیوان ہاتھ آگیا۔ کھولا تو یہ غزل نکلی

نفس موافق طبع جہانیاں نہ کشی
بہ ہر کجا کہ تبسم خزند شیون باش
چو سقفِ خانہ ہوا دار یک مقام مشو
گہے سحاب چمن گاہ دود گلخن باش

بجز متاعِ تجرد بہ بارِ خویش مبند
بہ ہر سفر کہ روی شرمسارِ رہزن باش

کیا عرض کروں، طبیعت کس درجہ محظوظ ہوئی۔ ساری تھکن
مٹ گئی، کوئی ہم نفس نہیں جسے اس ذوق و کیف میں شریک کرو
خیال آیا کہ آپ کو زحمتِ التفات دوں۔ امید ہے بخیر و عافیت
ہوں گے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ابوالکلا

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی۔ رئیس حبیب گنج (علیگڈھ)

۱۰ مئی سنہ ۱۹۴۲ء

صدیق حبیب

نامۂ وداد لطف بیز ہوا۔ جو خط آتا ہے، لطف تازہ لاتا ہے

بہ میخانہ راہم افتادہ ایست

کہ ہر شیشۂ وی پری خانہ ایست

کلیم کے کلام نے سرور موفور بخشا۔ قلمی کلیات نکلوا کر ساری غزل پڑھی۔ بیت الغزل وہی تین شعر ہیں جو زیب قلم ہوئے۔ فارسی ادب کا ذوق کھونے سے ملک نے بڑی نعمت کھودی۔ کیا جانفزا ادب تھا۔ دیکھیے کلیم کے یہی تینوں شعر اصول زندگی ہو سکتے ہیں، وہ زندگی جو کامیاب و کام بخش ہو۔ ایک لطیفہ ہاتھ آیا۔ حافظ شیرازی کی لسان الغیبی مسلّم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تخلّص کی برکت سے کلیم نے بھی یہ فیض پایا ہے۔ جس "گرفت" سے آپ نے حال میں نجات حاصل کی، اس کی طرف ہر شعر میں اشارے ہیں۔

نفس موافق طبع جہانیاں نہ کشی　　　　بہ ہر کجا کہ تبسم خزندہ شیون باش

قہقہوں اور تبسم کی کیا کمی تھی

بجز متاع تجرد بہ بار خویش مبند　　　　بہ ہر سفر کہ روی شرمسار رہزن باش

للہ در کلیم، رحمت بر کلیم، مرقع کھنچ گیا

بجواب گرامی نامہ ۲۴ اپریل کو کلکتہ ضراعت نامہ بھیج دیا ہے۔ حالیہ خط میں اس کا ذکر نہ دیکھنے سے واہمۂ عدم رسی ہوتا ہے۔ یہ شعر زیب قلم فرمایا گیا تھا

شراب لطف پر در جام مے ریزی و من ترسم
کہ زود آخر شود ایں نشہ و من در خمار افتم

جواب بداہۃً تصرف کر کے عرض کیا تھا:

شراب لُطف من دارم خم اندر خم چہ می ترسی
نہ زود آخر شود ایں نشہ و نے در خمار اُفتی

ایک روز کمال خجندی کا کلیات ہاتھ میں آگیا۔ دیکھا، پڑھا، دو شعر دل نواز بلکہ دل نشین ہوئے۔ عرض کروں

کمالی از کعبہ رفتی بر درِ یار　　　　ہزارت آفریں مردانہ رفتی

بکویش آمدن اے دل ترا ساخت   کہ ہشیار آمدی، دیوانہ رفتی!

ہزارت آفریں اے کمال! اس روز سے کتنی بار دونوں شعر پڑھتا ہوں اور حیاتِ تازہ کا لطف پاتا ہوں۔

للہ الحمد بخیر و آرزو مندِ عافیت احباب ہوں۔ والسّلام ختم الکلام

نیاز کیش

حبیب الرحمن

۱۹۔ اے بالی گنج۔ سرکلر روڈ، کلکتہ

۶ رمئی ۱۹۴۳ء

صدیق مکرم

نامۂ گرامی کے لیے شکر گذار ہوں۔

"قلیل منک یکفینی ولکن

قلیلک لا یقال لہ قلیل"

ابوالکلام

مولانا حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی۔ رئیس حبیب گنج علیگڑھ

کلکتہ

۲۰ر جون سنہ ۱۹۴۲ء

صدیق مکرم

ایک بات دریافت طلب ہے۔ محمد شاہی عہد میں آنندرام مخلص تھا۔ وزیر قمرالدین کا وکیل اور سراج الدین علی خاں آرزو اور شمس الدین فقیر کا ہم صحبت۔ اس نے ایک کتاب مرآۃ المصطلحات لکھی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مجھے ملا ہے۔ معلوم یہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب کبھی چھپی ہے یا نہیں۔ اگر آپ کی نظر سے مطبوعہ نسخہ گذرا ہو تو مطلع فرمائیے۔

امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام علیکم

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔ حبیب گنج، بھیکم پور علی گڈھ

وِیسرانگل لاج شملہ

۲۷ر جون ۱۹۴۵ء

صدیقِ مکرم

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت !

ابوالکلام

یکم جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق حبیب

جس دن بدرِ کامل گہن سے نکلا تھا، دل نے شہادت دی کہ نورِ محبت جاں نواز ہوگا۔ ہوا اور کس شان سے۔۔ ۲۷رجون کو بہار کی چہچہوں کا ہنگامہ ایک گروپ کے رنگ میں نظر آیا۔ اس میں ایک پیکرِ محبوب بھی تھی۔ قینچی لی، بمجمع اغیار سے جدا کیا۔ دیکھا۔ شیراز کی طرف سے صدا آئی:

روشن از پرتوِ رویت نظرے نیست کہ نیست
منتِ خاکِ درت بر بصرے نیست کہ نیست،

اس غزل کا ایک اور شعر شاید بے موقعہ نہ ہو۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز،
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست،

خیر یہ شیراز کا ترانہ تھا۔ کان لگاتا ہوں تو شملہ سے دوسرا ترانہ سامعہ نواز ہوتا ہے۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشینِ دل
می بینمت عیاں و دعامی فرستمت

جو کانوں نے سنا، تیرے روز نقوش دلفروزی کے پردے میں آنکھوں نے دیکھ لیا۔

اجازت ہو تو دوسرا مصرع میں بھی لکھ دوں۔

می بینمت عیاں و دعامی فرستمت

حبیب الرحمن

وائسرائگل لاج، شملہ

۶ر جولائی ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم

نامہ گرامی پہنچا

گرچہ دوریم بیادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

دل حکایتوں سے لبریز ہے مگر زبانِ درماندہ کو ابھی یارائے سخن نہیں۔ منتظرِ مہلت ہوں۔

ابوالکلام

وائسرائگل لاج، شملہ
۹ رجولائی ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم
نامۂ تعزیت کے لیے شکر گذار ہوں۔ ایک زخم ہو تو اس کا مرہم ڈھونڈھوں، اب تو دل سرتا سر زخم ہو چکا۔

پیش ازیں صد داغ بر دل داشتم اکنوں یکیست

مُلّا صاحب کی تعزیت کے لیے بھی شکر گذار ہوں۔

ابوالکلام

بہ مولانا ابوالکلام آزاد ہنگام ورود ایشاں بہ گل مرغ کشمیر

محو نظارۂ گل مرغ نگارے دارم
کز خیالش بہ دل زار بہارے دارم
اے نسیم سحری گر بہ حضورش گذری
عرضہ دہ شوق کہ در جان فگارے دارم
ور بپرسد کہ مگر شوق پیامے دارد
سر فرود آر و زمن گوے کہ آرے دارم

دوستاں را بہ نعمت یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خویش افشاند ثمر

اسیر آزاد حبیب
۵ رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۴ھ مطابق ۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۴۵ء

نسیم باغ سری نگر (کشمیر)
۲۶ر اگست ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم
زندگی میں بہت سی جستجوئیں کی تھیں، لیکن اب ایک نئی جستجو پیچھے لگ گئی ہے، یعنی اپنی گم شدہ صحت کا سراغ ڈھونڈھ رہا ہوں۔

نکل گئی ہے وہ کوسوں دیارِ حرماں سے

اطبا نے کشمیر کی وادیوں میں سراغ رسانی کا مشورہ دیا تھا، چنانچہ گلمرگ پہنچا اور تقریباً تین ہفتے وہاں بسر کئے لیکن گم شدہ صحت کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اب سری نگر آگیا ہوں اور ہاؤس بوٹ میں نسیم باغ کے پاس مقیم ہوں۔ شیفتہ نے یہاں بارعیش کھولا تھا۔

ہزار قافلۂ شوق می کند شبگیر کہ بارعیش کشاید بخطۂ کشمیر

میرے حصّہ میں ناخوشی و علالت کا بوجھ آیا ہے، اسے سر پر اٹھائے یہاں آیا تھا، اور سر پر اٹھائے واپس جاؤں گا، یہ کشمیر کی جان پرور آب و ہوا کا قصور نہیں ہے، میرے جسم ناساز کا قصور ہے۔

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازِ بے اندامِ ماست
ورنہ تشریف تو بر بالائے کس دشوار نیست

۱۹ ار کو جب گلمرگ سے سری نگر آ رہا تھا تو راہ میں ڈاک کھولی اور آپ کا نامہ منظوم ملا۔ کیا عرض کروں کس درجہ طبیعت متاثر ہوئی، سر تا پا شکر گذار اور ہمہ تن رہینِ منّت ہوں۔

قلیل منك یکفینی ولاکن
قلیلك لایقال لہٗ قلیل،

یہ خط آپ کے نامۂ منظوم کی رسید ہے جو مجھ کو لکھنا ہے، اس کے لیے مہلت کا انتظار کر رہا ہوں۔ انشاءاللہ ایک دو دن کے اندر کسی نہ کسی طرح وقت نکالوں گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی۔ حبیب گنج (علی گڈھ)

نسیم باغ - سری نگر
۴ ستمبر ۱۹۴۵ء

صدیق مکرم

وہی صبح چار بجے کا جانفزا وقت ہے - ہاؤس بوٹ میں مقیم ہوں دہنی طرف جھیل کی وسعت، شالا مار اور نشاط باغ تک پھیلی ہوئی ہے، بائیں طرف نسیم باغ کے چنار کے درختوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں - چائے پی رہا ہوں اور آپ کی یاد تازہ کر رہا ہوں ۔

گرچہ دوریم بہ یادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

گرفتاری سے پہلے آخری خط جو آپ کے نام لکھ سکا تھا، وہ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کی صبح کا تھا - کلکتہ سے بمبئی جا رہا تھا - ریل میں خط لکھ کر رکھ لیا کہ اجمل خاں صاحب کے حوالے کروں گا کہ نقل رکھ کر ڈاک میں

ڈال دیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ انھوں نے نقول رکھنے پر اصرار کیا تھا، لیکن بمبئی پہنچتے ہی کاموں کے ہجوم میں اس طرح گم ہوگیا کہ خط بھیجنے کا خیال نہ رہا۔ ۹ر اگست کی صبح کو جب مجھے گرفتار کرکے احمد نگر لے جا رہے تھے تو راہ میں بعض کاغذات دیکھنے کے لیے اٹاچی کیس کھولنا پڑا اور یکایک وہ خط سامنے آگیا۔ اب دنیا سے تمام علائق منقطع ہو چکے تھے اور ممکن نہ تھا کہ خط ڈاک میں ڈالا جا سکے۔ میں نے اسے اٹاچی کیس سے نکال کر کاغذات کے ایک فائل میں رکھ دیا

دو بجے ہم احمد نگر پہنچ گئے اور بیس منٹ کے بعد قلعہ کے اندر مقید تھے۔ اب اس دنیا میں جو قلعہ سے باہر تھی اور اس میں جو قید خانے کی چار دیواری کے اندر تھی، برسوں کی مسافت حائل ہوگئی۔

کیف الوصول الیٰ سعاد ودونہا

قلل الجبال ودونھن حتوف !

دوسرے دن یعنی ۱۰ر اگست کو حسبِ معمول صبح تین بجے اُٹھا چائے کا سامان جو سفر میں ساتھ رہتا ہے، وہاں بھی سامان کے ساتھ آگیا تھا۔ چائے دم دی، فنجان سامنے رکھا اور اپنے خیالات میں ڈوب

گیا۔ خیالات مختلف گوشوں میں بھٹکنے لگے تھے۔ اچانک وہ خط جو ۹ اگست کو ریل میں لکھا تھا، اور کاغذات میں پڑا تھا، سامنے آگیا بے اختیار خواہش پیدا ہوئی کہ کچھ دیر آپ کی مخاطبت میں بسر کروں اور آپ سن رہے ہوں یا نہ سن رہے ہوں مگر روئے سخن آپ کی طرف پھیر دوں چنانچہ اس عالم میں ایک مکتوب قلم بند ہوگیا۔ پھر اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے دن مختلف مکتوبات قلم بند ہوتے رہے۔ آگے چل کر بعض دوسرے احباب و اعزہ کی یاد بھی سامنے آتی رہی اور ان کی مخاطبت میں بھی گاہ گاہ بزم سخن آراستہ ہوتی رہی۔ قید خانے میں باہر کی دنیا سے علائق یک قلم منقطع ہو چکے تھے۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک پہنچ بھی سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوق مخاطبت کی طلبگاریوں نے کچھ ایسا مجبور کر دیا تھا کہ قلم اٹھا لیتا تو پھر رکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا لوگوں نے نامہ بری کا کام قاصدوں سے لیا ہو، میرے حصے میں عنقا آیا ہے۔

ایں رسم و راہ تازہ ز حرمانِ عہد ماست عنقا بروزگار کسے نامہ بر نہ بود

۱۰ اگست سنہ ۴۲ء سے مئی سنہ ۹۴۳ء کے اواخر تک ان کا سلسلہ بلا انقطاع

جاری رہا تھا لیکن اس کے بعد رُک گیا کیونکہ ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء[1] کے حادثہ کے بعد طبیع واماندۂ حال بھی رُک گئی تھی اور اپنی درماندگیوں میں گم تھی۔ اس زمانہ میں بعض مصنفات کی تحریر کا کام بدستور اپنے مقررہ اوقات میں چلتا رہا اور جو معمولات قلعہ احمد نگر کی زندگی میں قرار پاگئے تھے، ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، تاہم یہ حقیقتِ حال چھپانا نہیں چاہتا کہ یہ جو کچھ بھی قرار و سکون کی حالت تھی جسم و صورت کی تھی، قلب و روح کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے ہلنے سے بچالیا تھا مگر دل کو نہیں بچا سکتا تھا۔

ولے دیوانہ دارم کہ در صحراست پنداری

اس کے بعد بھی گاہ گاہ واقعات کی تحریک کام کرتی رہی اور رشتۂ فکر کی گرہیں کھلتی رہیں۔ تاہم سلسلۂ کتابت کی وہ تیز رفتاری قائم نہ رہی جو اوائل میں ساتھ دیتی رہی تھی۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جب احمد نگر سے بانکوڑا میں قید تبدیل کردی گئی تو طبیعت کی آمادگیوں نے بالکل جواب دیدیا تھا بانکوڑا میں صرف بعض مصنفات کی تکمیل کا کام جاری رکھا جا سکا اور کسی بات کی طرف طبیعت متوجہ نہ ہوسکی آخری مکتوب جو بعض سیاسی مسائل و حالات کی نسبت ایک عزیز کے نام

---

[1] رحلتِ شریکِ حیات ۱۲ شاہد شروانی

قلمبند ہوا۔ ۲ر مارچ ۱۹۴۵ء کا ہی۔ اس پہ یہ داستان بے ستون و کوہ کن ختم ہوجاتی ہی اگرچہ زندگی ابھی تک ختم نہیں ہوئی ہے

ثمہ از داستان عشق شور انگیز ماست

ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

غور کیجیے، تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی کچھ عجیب حال ہی۔ تین برس ہوں، یا تین دن، تین گھنٹے ہوں یا تین لمحے، لیکن جب گذرنے پر آتے ہیں تو گذر ہی جاتے ہیں —— زیں ہوسہا بگذریا نہ گذرمی گذرد

رہائی کے بعد جب ۱۲ جون کو کلکتہ سے بمبئی آیا اور اسی دوست کے یہاں اسی کمرہ میں ٹھہرا جہاں تین برس پہلے اگست ۱۹۴۲ء میں ٹھہرا تھا تو یقین کیجیے ایسا محسوس ہونے لگا جیسا ۹ر اگست ۱۹۴۲ء کا سارا ماجرا کل کی بات تھی، اور یہ پورا زمانہ ایک صبح شام سے زیادہ نہ تھا۔ حیران تھا کہ جو کچھ گذر چکا وہ خواب تھا، یا جو کچھ اب دیکھ رہا ہوں، وہ خواب ہے؟

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

جس دن بانکوڑا میں رہا ہوا تھا، یہ تمام مکتوبات نکالے تھے اور ایک فائل میں بہ ترتیب تاریخ جمع کر دیے تھے خیال تھا کہ انھیں نقل کرنے کے لیے دیدوں گا

اور پھر اصل آپ کی خدمت میں بھیج دوں گا، لیکن شملہ میں بعض احباب کی نظر سے بعض مکاتیب گذرے تو وہ مصر ہوئے کہ انھیں بلا تاخیر طباعت کے لیے دیدوں چنانچہ اب ایک خوشنویس مرادآباد میں انکی کتابت کر رہے ہیں۔ اور تمام مسودات انہی کے پاس ہیں۔ انشاء اللہ عنقریب وہ ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہو جائیں گے اور میں قلمی مکاتیب کی جگہ مطبوعہ مکاتیب کا نسخہ آپ کی خدمت میں بھیجوں گا۔ اس سلسلہ کا پہلا مکتوب شملہ میں ایڈیٹر صاحب اخبار مدینہ نے اجمل خاں صاحب سے لے لیا تھا جو اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ شاید آپ کی نظر سے گذرا ہو۔ "صدیق مکرم" کے تخاطب سے آپ سمجھ گئے ہونگے کہ روئے سخن آپ ہی کی طرف تھا

چشم سوئے فلک و روئے سخن سوئے تو بود

مکتوبات کے دو حصے کر دیے ہیں غیر سیاسی اور سیاسی۔ ابھی پہلے حصے کی کتابت ہو رہی ہے اس کے تمام مکاتیب بلا استثناء آپ کے نام ہیں

پرسوں ۷ ر کو یہاں سے دہلی جا رہا ہوں۔ چونکہ امریکن دوستوں کی عنایت سے ہوائی جہاز کا انتظام ہو گیا ہے۔ اس لئے ڈھائی گھنٹہ میں دہلی پہنچ جاؤنگا۔ اور پھر عید وہاں کرکے بمبئی کا قصد کروں گا۔ ۱۰ ر سے ۱۴ ر تک وہیں قیام رہیگا۔ ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی حبیب گنج ضلع علیگڈھ

۴ر مئی سنہ ۱۹۴۶ء

غبار راہ گشتم، سرمہ گشتم توتیا گشتم
بچندیں راہ گشتم تا بہ چشمت آشنا گشتم

صدیق حبیب، بہ دل قریب۔

اس روز لکھنؤ میں نظارۂ جمال اگرچہ ع

"خورشید درخشید ولے دولت مستعجل بود"

کا مصداق تھا، تاہم دل[1] میں گرمیٔ شوق پیدا کرنے میں کامیاب تھا، دن بھر مکرّر شوقِ لقا کی تمنا رہی۔ شب کو دوبارہ ٹیلیفون کیا، مگر ہجوم مشاغل سامی باریابی میں حارج رہا۔ تقاضائے شوق تھا کہ چند ساعتیں لطف صحبت بخشش دور چار ہو۔ ایک تازہ مضمون گوش گذار کروں مگر دل کی تمنّا دل میں رہی۔ اسی

---

[1] دن کے بجائے دل قلم سے نکل گیا۔ اس پر نواب صاحب نے یہ نوٹ دیا: دیکھئے گرمی شوق کا اثر "دن کے بجائے قلم سے "دل" نکلا۔ شاہد شروانی

عرصہ میں دو نسخے "غبارِ خاطر" کے نور افزا ہوئے غبار اور نور افزائی! ہاں نور افزائی غبار تھا۔ کوئے دوست کا، آنکھوں سے لگایا، پڑھا، پڑھوں گا۔ زہے قسمت کہ گوشۂ تنہائی میں انیس صحبت حبیب ہا۔ بزم انس اس قدر طویل کہ ایک مجلد کا سامان تھی۔ میرا خیال ہو کہ یہ واقعہ تاریخی واقعہ بنے گا۔

"شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو"

باز آیم بر سر مطلب تازہ مضمون یہ تھا

شکر للہ کہ بروئے تو قدح می نوشیم
جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی

(حسرتؔ شروانی)

گرچہ دوریم بہ یادِ قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی!

ہی ابھی غالب ہے

تمنا تھی کہ چائے کا پیالہ ہاتھ میں، یہ مضمون زبان پر ہوتا۔ خیر وہ تمنا پوری نہ ہوئی تو تحریر کے ذریعے سے سُنا دیا۔ کبھی انشاء اللہ تمنائے لقا بھی حاصل ہو جائے گی۔

آج کل آپ کی مصروفیتیں قلم روک رہی ہیں، اس لیے ختم کلام۔

والسّلام ختم الکلام

نیازنشان حبیب الرّحمٰن

اجمل خاں صاحب مکرم

اول تعمیل ارشاد ہوئی۔ اس کے بعد مطالعہ۔ دونوں نسخے صحیح کر لیے گئے۔

شملہ

۱۱ر مئی ۱۹۳۶ء

صدیق مکرم۔ نامۂ گرامی کے لیے تشکر یہ۔ جونہی مہلت ملی۔ مخاطبت کی خوش وقتی حاصل کروں گا۔ والسّلام علیکم

ابوالکلام

جناب مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی رئیس حبیب گنج ضلع علی گڈھ

کاروانِ خیال کا پروف تیار ہو چکا تھا کہ مراسلت کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ جی چاہا کہ ان خطوط کو بھی شاملِ مکاتیب کر دیا جائے نواب صدر یار جنگ بہادر نے میری گذارش پر یہ خطوط بھی عنایت فرما دیئے۔ مولانا آزاد کا مراسلہ تحفہ "موہائٹ جیسمین" کاٹین عید الاضحی کی صبح کو نواب صاحب کو وصول ہوا نواب صاحب کے آخری خط میں جس مجلس چائے نوشی کا ذکر ہے اس میں اپنی خوش بختی سے میں بھی شریک تھا۔ بلکہ اس مجلس کا انعقاد ہی مجھ پر کرم بے پایاں کا ثبوت تھا۔ لطفِ اتفاق کی بات یہ ہے کہ نواب صاحب ہمرنگِ چائے مخملی ٹوپی زیبِ فرق فرمائے ہوئے تھے۔ اس منظر کے ساتھ دلگیر اکبر آبادی مرحوم کا یہ شعر بے ساختہ زبان پر آ گیا۔

عکسِ جمال ~~کلاہ~~ ہے جامِ شراب میں
اک آفتاب اور بھی ہے آفتاب میں

شاہد شروانی، یکم نومبر ۱۹۴۶ء

مسوری، ۱۰ر جون ۱۹۴۶ء

صدیق مکرم۔ آپ کا ہر مکتوب پڑھ کر خوشی ہوتی ہے۔ مگر آخری مکتوب پڑھ کر خصوصیت کے ساتھ طبیعت مسرور ہوئی۔ اول تو اس لیے کہ آپ نے ایک چیز کی فرمائش کی، پھر فرمائش بھی کی تو ایسی چیز کی جس سے اشتراک ذوق کا رشتہ اور زیادہ استوار ہو گیا۔ یعنی چینی چائے کی

دوائے درد دلِ خود ازاں مفرح جوئے

کہ در صراحیِ چینی و شیشۂ حلبی ست

مگر سوئے اتفاق دیکھئے کہ

آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

وہائٹ جیسمین چائے ختم ہو چکی ہے اور اس کی جگہ ایک دوسری چینی چائے سے کام لے رہا ہوں جو کلکتہ کے ایک چینی دوست نے بھیجی تھی۔ سفر میں جس قدر ساتھ تھی اس کے دو حصے کئے ایک حصہ رکھ لیا۔ ایک حصہ

مرسلِ خدمت ہے شرمندہ ہوں کہ اس قلیل مقدار سے زیادہ اس وقت نہ بھیج سکا۔

زاہد از ماخوشۂ تاکے بہ چشم کم مبیں
ایں نمی دانی کہ یک پیمانہ نقصاں کردہ ام

وہائٹ جیسمین امید ہے کہ ۱۵ر جون تک کلکتہ پہنچ جائے۔ چار ڈبوں کی توقع ہے۔ دو ڈبے بلا تاخیر مرسلِ خدمت ہوں گے۔ کلکتہ اطلاع دے رہا ہوں تاکہ براہ راست روانہ کر دیئے جائیں

اعلیٰ درجہ کی سبز چائے بھی آج کل نہیں ملتی۔ وہ بھی منگوائی ہے۔ اگر آگئی تو اس میں بھی آپ شریک مساوی ہوں گے

جو چائے بھیج رہا ہوں یہ بھی بری نہیں ہے لیکن وہائٹ جیسمین کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی بہت کم مقدار چار دانی میں ڈالنی چاہیئے ورنہ تلخ ہو جائیگی نیز ضروری ہے کہ کم از کم پانچ منٹ تک توقف کیا جائے۔ میں دس منٹ تک انتظار کرتا ہوں۔

ابوالکلام

دہلی۔
۱ر نومبر ۱۹۴۶ء

صدیق مکرم

سید نظیر حسین والانامہ لے کر آئے جو کچھ ان کے لیے کر سکتا تھا، کر چکا ہوں، امید ہے کہ سودمند ہوگا۔ عرصہ ہوا کہ مسوری میں آپ کا ایک والانامہ ملا تھا جس میں وہائٹ جیسمین چائے کی فرمائش تھی۔ اس وقت میں خود تشنہ لب تھا۔ اس لیے عذرخواہ ہوا اور ایک دوسری چینی چائے بطور نمونہ کے بھجوا دی۔ اب وہائٹ جیسمین کا ایک ڈبہ آگیا ہے، اس میں سے تھوڑی سی یہاں رکھ لی ہے باقی روانۂ خدمت کرتا ہوں۔ امید ہے کہ پسند خاطر ہو۔

مے خور بہ شعر بندہ کہ دل تنگیت مباد
بعد از تو خاک بر سر اسباب دنیوی

بہت جی چاہتا ہے کہ یک جائی کی صورت نکلے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ادھر قصد کر رہا ہوں کہ کچھ عرصے دہرہ دون میں قیام کروں کیونکہ صحت جواب دے رہی ہے اور ڈاکٹروں کا تقاضا ہے کہ دو تین ہفتے سکونِ خاطر کے ضرور نکالوں۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ آپ دو چار دن کے لیے دہرہ دون تشریف لا سکتے اور میرے ساتھ قیام فرماتے

فرخندہ شبے باید و خوش مہتابے
تا با تو شکایت کنم از ہر بابے

امید ہے مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔

مخلصکم الوفی ابو الکلام

حبیب گنج، ضلع علیگڑھ

۷ار ذی الحجۃ الحرام سنہ ۱۳۶۵ھ

"صدیق مکرم" کے مکرم باکرامت السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'
اول تبریک عید پیش کروں۔ اپنے استاذ الاستاذ مولانا سید حسین شاہ
صاحب واصف بخاری مرحوم کی ایک برجستہ رباعی سناؤں ؎

غم زہر سینہ بعید است کہ عید است امروز
وہ ! چہ روز خوش و میمون و سعید است امروز
ترک تاز الم و شام غم و صبحِ طرب
آرمیدست و رمیدست و دمیدست امروز

اس کے بعد تشکر یاد فرمائی ادا کروں۔ لفافہ انگریزی میں تھا، معمولی
تحریر خیال کی، کھولنے کو الٹا تو اسم گرامی مرقوم تھا۔ جنبش شوق کے ساتھ
کھولا۔ نقوش تاباں دیدہ افروز و دل نواز ہوئے۔

چاے خطائی کی آمد کا مژدہ پڑھا۔ دل چاہا کہ چاے پی لوں تب شکرانہ کرامت پیش کروں۔ چاے آئی۔ کیا خوب آئی۔ پی۔ دل نے گرمیِ محبت کے ساتھ وادیِ خطا کی سیر کا لطف حاصل کیا

ایک زمانہ کی سنی ہوئی رباعی ایرانی شاعر کی نوشتہ یاد آئی۔

اے چاے چہ گویمت چہائی
در عالم جسم کیمیائی
در پاکیٔ طینتت خطا نیست
ہر چند کہ زادۂ خطائی

اس سلسلے میں ایک عجیب حُسنِ اتفاق ہو، جب کہ آپ کی چاے کی فنجان سے ہاتھ گرم ہوا اردو کا ایک رسالہ کھول کر پڑھا۔ سرآغاز "عنبریں چاے" کے عنوان سے ایک نوٹ نظر آیا۔ گویا آپ کی اور آپ کی چاے کی تصویر تھی۔ کمالِ تصوّر یہ کہ سطرِ آخر لفظ آزاد سے مزیّن ہے۔ تراشہ ہمنوردِ نامۂ شوق کرتا ہوں۔

کششِ شوق اس سے بھی بڑھ کر کرشمے دکھاتی ہے

دو الطاف نامے سامنے ہیں۔ ایک میں آمدِ چاے کی خبر ہے۔ دوسرے

میں قدوم دہرہ دون کی۔ اس کے ساتھ مخلص کی یاد فرمائی۔ یقین کیجئے دل مسرتِ شوق سے تڑپ گیا۔ آیئے آیئے انشاء اللہ تعالیٰ لطف ہم دلی و ہم نشینی حاصل ہو گا۔ مُلاجی بھی ساتھ ہوں گے۔ خبر سُن کر ابھی سے دو بجے رات کو دودھ لانے کا سودا پکا رہے ہیں۔

ماشاء اللہ کیا پُر لطف وقت ہو گا جبکہ

گرچہ دوریم بہ یادِ تو قدح می نوشیم
بُعدِ منزل نہ بود در سفرِ روحانی

کے جواب میں اپنا ایک شعر عرض کروں گا:

شکر للہ! بروئے تو قدح می نوشیم
جلوۂ قرب نمودہ سفرِ جسمانی

آپ کی صحت صرف آپ کی ملکیت نہیں ہے، ملک و ملت برابر کے بلکہ شریک غالب ہیں۔ ایک با اخلاص مخلص بھی۔ لہٰذا اس کی حفاظت کی خاطر سے آرام کیجئے۔ دہرہ کا سفر کیجئے۔ مخلص کی یاد فرمائی ہو۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ عافیت سے ہوں۔ آپ کی صحت و عافیت کا دل سے متمنی۔ والسلام ختم الکلام

نیاز نشان حبیب الرحمٰن

عَنْبَرِیْ چائے

...... یوں تو وقت پر ہر چا مزا دیتی ہے لیکن جو لطف جو کیف لوجستی (سفید چمیلی) اور عنبریں چائے میں ہے، وہ بات کچے گھڑے والی کو کہاں نصیب، صبح وقت کیتلی سامنے ہو، اور اگر دم دیتے بن پڑے تو ایسا (لون) پیدا ہو کہ ارغوانی کو انسان بھول جائے اور پھر کوئی رنگ نظر میں نہ سمائے۔ کیتلی سے فنجان میں آئے، معلوم ہو کہ شیشے میں پری اتر آئی، اور اگر ایک جرعہ حلق سے نیچے اتر جائے تو ہر گرفتار "آزاد" بن جائے۔

انور علی شاہ پرنٹر پبلشر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر مکتبہ احباب
وسن پورہ لاہور سے شائع کیا

مکتبۂ احباب

وسن پورہ ○ لاہور